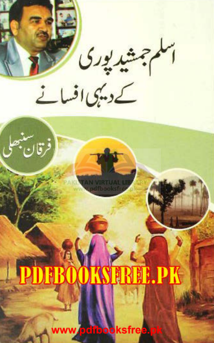

اسلم جمشید پوری
کے دیہی افسانے
فرقان سنبھلی
PDFBOOKSFREE.PK
www.pdfbooksfree.pk

اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے

فرقان سنبھلی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ASLAM JAMSHED PURI KE DEHI AFSANE

by

Furqan Sambhali

Year of Edition 2014

ISBN 978-93-5073-451-3

₹ 200/-

نام کتاب : اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے

مصنف : فرقان سنبھلی

سن اشاعت : ۲۰۱۴ء

قیمت : ۲۰۰ روپے

کمپوزنگ : سعید سہارنپوری

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

انتساب

دیہی افسانوں کے

بنیاد گذار

اور اردو افسانے کے بابا آدم

منشی پریم چند

کی نذر

کہ جن کے افسانوں نے دیہات کی زندگی

کو بھی افسانے کا موضوع بنایا۔

فہرست

☆☆

پیش لفظ

جولائی 2010 میں اسلم جمشید پوری نے مجھے فون کر کے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں منعقد ہو رہے عالمی اردو فیسٹیول میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور پہنچ گیا میرٹھ۔ چار روزہ اردو فیسٹیول کے دوران متعدد پروگرام منعقد ہوئے۔ 1985 کے بعد اردو افسانہ کے تعلق سے سیمینار ہوا۔ شام افسانہ کا انعقاد ہوا جس میں ایک افسانہ میں نے بھی پڑھا۔ مشاعرہ کا انعقاد، محفل غزل سرائی اور ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ اردو فیسٹیول میں شرکت کے لیے اردو کے موقر نقاد، افسانہ نگار اور شاعر جمع ہوئے تھے۔ ان میں معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی، معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف، پیغام آفاقی، شوکت حیات، نورالحسنین، احمد صغیر، مشرف عالم ذوقی، مشتاق صدف، مولا بخش، انور پاشا وغیرہ ملک بھر کی علمی شخصیات موجود تھیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری سے ان چار دنوں کے دوران ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ بہترین منتظم بھی ہیں یہ اسی دوران پتہ چلا تمام اسٹاف کے ساتھ خود فرداً فرداً سب مہمانان سے رابطہ رکھنا اور ان کے مسائل کو فوری طور پر حل کرانا۔ سیمینار کے تمام سیشن بروقت مکمل ہوں اس کی فکر موسم کی خرابی کے باوجود مہمانوں کو کسی طرح کی پریشانی نہ ہونے دینا یہ تمام کام اسلم جمشید پوری بخوبی نبھا رہے تھے۔ شعبہ کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کس محنت اور جذبۂ خلوص کے ساتھ انھوں نے شعبہ کا قیام عمل میں لایا ہے یقیناً یہ قابل

تحسین ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ اسلم جمشید پوری سے تعلق مضبوط ہوا اور اکثر فون پر بھی گفتگو ہوتی رہتی۔ انھوں نے مجھے اپنے افسانوی مجموعے "لینڈرا" اور "افق کی مسکراہٹ" بھیجے۔ اس سے قبل کئی افسانے موقر ادبی رسالوں میں پڑھ چکا تھا۔ ان کا اسلوب اور افسانوں کا ٹریٹمنٹ اس قدر متاثر کن ہے کہ میں نے دونوں مجموعے کئی مرتبہ پڑھے۔ ہر مرتبہ نئے معنی دریافت ہوئے۔ ان کے کئی افسانے معنی کی تہہ داری کے بہترین نمونے ہیں۔ اسلم جمشید پوری نے اپنی افسانوی کائنات اپنے اردگرد کے ماحول پر قائم کی ہے۔ ان کے کردار ہمارے اردگرد کے حقیقی کردار ہیں۔ ہم ان کرداروں کو اپنے آس پاس سسکتے اٹھلاتے اور زندگی کے مسائل کو چیلنج کی طرح لیتے دیکھ سکتے ہیں حالانکہ ان کی باطنی زندگی کو سمجھنے کے لیے ہمیں اسلم جمشید پوری کے افسانوں کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنا پڑے گا۔

اسلم جمشید پوری نے شہری اور دیہی زندگی اور ان کے مسائل دونوں کے تعلق سے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کو میں اسی طرح Catagize کرنا پسند کرتا ہوں۔ وجہ صاف ہے کہ اسلم جمشید پوری کے افسانوں میں اس قدر موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے کہ موضوع کی بنیاد پر ان کے افسانوں کی تقسیم مشکل دکھائی دیتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ اسلم جمشید پوری کے دیہی ماحول کی عکاسی کرنے والے افسانے بے حد پسند ہیں۔ انھوں نے دیہات کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور ان کا مشاہدہ بھی انتہائی زبردست ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا خام مواد اپنے مطالعہ و مشاہدہ کی بنیاد پر ہی جمع کیا ہے۔ پھر ان کو مختلف تکنیکوں کے ذریعے افسانوی قالب میں ڈھالا ہے۔ ان افسانوں میں دیہات کے دلکش مناظر، یہاں کی زندگی کے مسائل، مشترک کلچر، کرداروں کی باطنی و خارجی کیفیت اور متاثر کن اسلوب نے ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کا احساس کرایا ہے۔

دیہات کے افسانوں کے تعلق سے پریم چند کی افسانہ نگاری کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھانے کی کوشش اسلم جمشید پوری کے افسانوں میں دکھائی دیتی

ہے۔ اسلم جمشید پوری کسی تحریک یا رجحان کو اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیتے ہیں۔ ان کے موضوعات حقیقی ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس لیے وہ کسی بھی ازم سے دور رہ کر اپنی افسانوی دنیا قائم ہیں۔ یہی نہیں اپنے سے بعد کی نسل کو بھی تحریک دے رہے ہیں۔ اسلم جمشید پوری کے دیہات پرمبنی افسانوں نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے طے کیا کہ اسلم جمشید پوری کے دیہی مسائل پرمبنی افسانوں کا ایک کلیکشن شائع کروں۔ مجھے خوشی ہے کہ میری خواہش کے عین مطابق یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

ایک ہی موضوع کے تعلق سے مجموعہ شائع کرنے میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ افسانے یک رنگی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اسلم جمشید پوری کے ان افسانوں میں جس طرح کی رنگا رنگی ہے وہ یکسانیت کے رنگ کو غالب نہیں ہونے دیتی۔ مجھے امید ہے کہ مجموعے کے تمام افسانے پڑھنے کے بعد کہیں بھی یک رنگی کا احساس نہیں ہوگا۔ مجموعے کے افسانے دیہات کے کرب کو منفرد انداز میں سامنے لاتے ہیں اور آج کے گاؤں کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس مجموعے کی تیاری میں معاون حضرات کا شکریہ ادا نہ کیا جائے۔ اسلم جمشید پوری کا بے حد شکریہ کہ انھوں نے میری خواہش کے احترام میں اس بات کی اجازت دے دی کہ ان کے افسانوں میں سے دیہی افسانوں کا انتخاب کر کے شائع کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ان تمام دوستوں، کرم فرماؤں اور معاونین کا بے حد شکریہ جنھوں نے کسی طور بھی میری مدد فرمائی۔ اپنے عزیز دوست عبدالرازق کا بھی بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے تمام تر مصروفیات کے باوجود کمپوزنگ کا کام نہایت خوش اسلوبی اور کم وقت میں مکمل کر دیا۔ شریک حیات شمیم فاطمہ اور پیارے بچوں عاطر اور عبداللہ کا بے حد شکریہ جنھوں نے مجھے اس مجموعے کی اشاعت تک کے مرحلے میں اہم تعاون دیا اور اپنے اس واجب وقت کا مطالبہ نہیں کیا جو کہ ان کا حق تھا۔ شریک حیات شمیم فاطمہ ایڈووکیٹ نے اپنے قیمتی مشوروں کے ذریعے انتخاب کی ترتیب میں آسانیاں پیدا کیں۔

جس کے لیے ان کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ مجموعے پر قارئین کی رائے کا ہمیشہ کی طرح انتظار رہے گا کہ انہی آراء کے ذریعے مجھے اپنی آئندہ کی ادبی سرگرمیاں طے کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

شکریہ

انجینئر محمد فرقان سنبھلی

۱۶ جولائی ۲۰۱۴ء

☆☆

اردو افسانے کی دیہی روایت

ہندوستان کی ۸۰ فیصدی آبادی گاؤں میں رہتی ہے شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا دل گاؤں میں بستا ہے۔ گاؤں کے ماحول اور معاشرے کی تصویر ہی بنیادی طور پر ہندوستان کی اصل تصویر تسلیم کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی دیہی زندگی، یہاں کے مسائل اور تہذیب شہر سے یکسر مختلف ہے۔ دراصل گاؤں کا تصور کھیت کھلیان کے بغیر ادھورا ہے۔ مٹی کو فصلوں کے لیے تیار کرنا، آب پاشی کے لیے بارش کا انتظار کرنا، فصلوں کے پکنے کا انتظار یہ گاؤں کی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ اگر وقت پر بارش ہوگئی تو فصل پکنے پر خوشیوں کے گیت سننے کو ملیں اور اگر بارش وقت پر نہ ہوئی تو بھوک اور افلاس کی آہیں گاؤں کو سونا کر دیں۔ گاؤں کے سادہ دل لوگوں کی جذباتی زندگی میں خوشی بلاشبہ اہمیت رکھتی ہے اور غم کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

قدیم گاؤں کے معاشرے میں جاگیردارانہ نظام نافذ تھا جس نے گاؤں کی فضا میں ایسے کردار پیدا کیے جن کی وجہ سے سماجی اور نفسیاتی مطالعے کا منفرد مواد فراہم ہوتا ہے۔ ادب چونکہ سماج اور ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے ہر دور میں ادب اپنے ماحول اور معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ تمام شعری اور نثری ادب میں شہر کے ساتھ ساتھ گاؤں کی زندگی، یہاں کی فضا اور ماحول کو پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اردو افسانہ اپنے آغاز سے

اب تک ہندوستان کے ماحول اور معاشرے کا بڑا سچا عکاس رہا ہے اردو افسانے میں گاؤں کی فضا، عوامی جذبات و مسائل کے انتہائی واضح اور روشن نقوش بہت ہی نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

اردو افسانے کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا۔ اس وقت سجاد حیدر یلدرم رومانی رجحان کے قافلہ سالار بن کر ابھرے ان کے ساتھ ساتھ نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، مجنوں گورکھپوری وغیرہ افسانہ نگاروں نے رومان کی وادی میں سیر کی لیکن باوجود اس کے اپنے ملک کی فضاؤں اور گاؤں کی زندگی کی عکاسی ان کے یہاں بھی کسی نہ کسی طور موجود ہے۔ سلطان حیدر جوش رومانی تحریک سے وابستہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بدایوں اور روہیل کھنڈ کے علاقوں خصوصاً دیہات کی پیش کش اپنے افسانوں میں عمدہ پیرائے میں کی ہے۔ ان کے دو مجموعے "فسانہ جوش" اور "فکر جوش" کے زیادہ افسانے دیہی زندگی کے عکاس ہیں۔ پریم چند نے دیہی تہذیب اور دیہی مسائل پر خصوصی توجہ مرکوز کی۔ ان کے افسانوں میں گاؤں کی زندگی اپنی تمام تر جزئیات اور اپنے سارے رنگوں کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ پریم چند کی روش کو اختیار کرنے والوں میں اعظم کریوی، پنڈت سدرشن اور علی عباس حسینی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ انھوں نے بھی پریم چند کی طرح گاؤں کی زندگی اور مسائل کو سچائی اور دیانت داری کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ افسانوی مجموعے "انگارے" کی اشاعت اور اس کی ضبطی نے اردو ادب کو ترقی پسندی کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

پریم چند کے عہد کے بعد ۱۹۶۰ء تک اردو افسانہ نگاری ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہی رہی۔ اردو افسانہ نگاری پر اس ادبی تحریک کے زبردست اثرات مرتب ہوئے۔ اردو افسانہ نگاری کا یہ زریں دور تھا جس دور میں کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری وغیرہ افسانہ نگاروں نے ترقی پسند ادبی تحریک کے زیر اثر اعلیٰ ترین ادب کے نمونے پیش کیے۔ ان میں بہت سے افسانے ہندوستانی گاؤں کی زندگی اور مسائل کے عکاس ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کا رجحان پیدا ہوا۔ جس کے زیر اثر اردو افسانے نے نئی کروٹ لی۔ صنعتی عہد میں انسانی اقدار کی شکست و ریخت اور اس سے پیدا ہونے والی فرد کی داخلی الجھنوں کو علامتی انداز میں پیش کرنا اس عہد کے افسانہ نگاروں کا خاص کارنامہ تھا۔ سریندر پرکاش، بلراج مین را، سلام بن رزاق وغیرہ اس دور کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ یہ افسانہ نگار بھی اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود اردگرد کے ماحول سے بے نیاز نہیں رہ سکے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں بھی گاؤں کا ماحول در آیا ہے۔ حالانکہ گاؤں کا عکس ان کے یہاں بہت کم ہے۔

انیسویں صدی میں انگریزوں نے ملک پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے۔ انگریز اس حقیقت سے بھی کما حقہ واقف ہو چکے تھے کہ ملک کے نظم وضبط کو استحکام دینے کے لیے چند مخصوص شہروں کو مرکزی حیثیت دینی ہوگی۔ اس لیے کچھ شہروں کو صنعتی ترقی کے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس طرح ۸۰ فیصدی گاؤں کی آبادی والے ہندوستان کا نظم وضبط شہر سے ہونے لگا۔ بیسویں صدی کے آغاز پر ملک متعدد معاشی اور ذہنی تبدیلیوں، سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشی تحریکوں سے دوچار ہوا۔ سماجی، سیاسی اور معاشی بیداری، جدید تعلیم کے عام ہونے اور جدید صنعتوں کے قیام کے باعث مختلف شعبوں سے وابستہ لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا جس سے ان میں ملک کے علاوہ دور دراز ممالک کے مسائل اور وہاں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھنے سمجھنے کا موقع بھی ملا۔ اس طرح زندگی کے نئے مسائل سامنے آنے لگے۔ نئی تحریکیں وجود میں آئیں اور عوام میں بیداری پیدا ہوئی نیز ان کی قوت مشاہدہ میں بھی اضافہ ہوا۔

اردو افسانہ کے اولین دور میں گاؤں کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی۔ اردو کے اہم ترین افسانہ نگار پریم چند نے اپنے فن کا اولین نقش گاؤں کے افسانے کی اساس پر ہی مرتب کیا۔ ایک طرح سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو افسانے میں گاؤں کو پیش کرنے کی صحت مند روایت کا آغاز پریم چند سے ہی ہوا۔ پریم چند نے اردگرد سے مواد حاصل کر کے افسانے

لکھے۔ انھوں نے گاؤں کی طرف نگاہ کی اور دیکھا کہ گاؤں تہذیبی ترقی سے کوسوں دور ہیں لیکن ان کا داخلی نظام بے حد مضبوط ہے۔ پریم چند نے عوام اور عوامی زندگی کے مسائل کو خواص کے مسائل پر ترجیح دی۔ محنت کش طبقہ، غریب مزدور کسان اور ایسے ہی دبے کچلے کرداران کے افسانوں میں اپنی تمام تر محرومیوں کے ساتھ موجود ہیں پریم چند نے جاگیرداروں، صنعتی نظام کی کمزوریوں اور استحصالی حربوں کو بے نقاب کیا۔

پریم چند نے گاؤں میں آنکھ کھولی اور ان کی تربیت بھی گاؤں کے ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز مدرس کے طور پر کیا۔ لیکن وہ جلد ہی اس سے اوب گئے۔ والد کی ملازمت، اپنی نوکری اور بچپن کی زندگی کے دوران انھیں گاؤں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پریم چند کی تخلیقی زندگی کا آغاز ایسے دور میں ہوا تھا جب کہ پورا برصغیر ہنگامہ خیز، متحرک اور سیاسی بیداری کے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ سماج جمود توڑ کر نئی کروٹ لے رہا تھا اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

پریم چند کے افسانے ''راہ نجات'' کا بدھو اور جھینگر برصغیر کے گاؤں کے نمائندہ کردار ہیں۔ بدھو چرواہا ہے۔ جو کہ اپنی بھیڑوں پر فخر کرتا ہے اور جھینگر کسان ہے جو کہ اپنے کھیت پر مغرور ہے۔ دونوں کے درمیان ان کے اہم ہونے کی وجہ سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ جس میں جھینگر کا کھیت اور بدھو کے بھیڑ دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔ انتقام کی آگ ان کی پرسکون زندگیوں کو انتشار اور بربادی کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ جھینگر کو بیلداری کرنی پڑتی ہے اور بدھو کو مزدوری۔ حالات ان کے درمیان کی انتقامی آگ کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتے ہیں کیونکہ اب دونوں پچھتاوے کے عمل سے گزر رہے ہیں:

''تمہاری ایکھ میں آگ میں نے لگائی تھی''
جھینگر مذاق آمیز لہجے میں کہتا ہے ''میں جانتا ہوں'' ذرا دیر
بعد جھینگر کا ضمیر بھی جاگ اٹھتا ہے وہ داخلی ملامت برداشت نہیں

کرپاتا اور گوبتیا کا الزام اپنے سر لینے کے لیے کہتا ہے۔

"بچھیا میں نے ہی باندھی تھی اور ہری ہرنے اسے کچھ کھلا دیا تھا"

بدھو اسی لہجے میں کہتا ہے "جانتا ہوں"

(افسانوی مجموعہ فردوس خیال ص ۲۷)

اور پھر دونوں سکون کی نیند سو جاتے ہیں کہ دونوں نے اپنے سر کا بوجھ اتار دیا تھا۔ ان کا اعتراف گناہ انھیں "راونجات" دلا دیتا ہے۔

پریم چند نے پہلی جنگ آزادی کے اثرات پر افسانے لکھے ان کا افسانہ "قربانی" میں "ہرکھو" کی کایا پلٹ میں جنگ اور معاشی پالیسی کے اثرات نمایاں ہیں۔ ہرکھو اپنی زراعت اور شکر کی دیہی صنعت کی بنیاد پر اہم شخصیت تھا اس کی صنعت سے گاؤں کے کئی کسان وابستہ تھے جو کہ شکر کی صنعت کی وجہ سے ہی زندہ تھے۔ لیکن اس کی تباہی سے گاؤں کے بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ دراصل بدیسی شکر کی آمد نے "ہرکھو" کی صنعت کو بہت بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ کئی گھروں میں روٹی کے لالے پڑ گئے تھے خود ہرکھو کی تباہی، اس کی موت اور اس کے لڑکے گردھاری کی انتہائی مفلسی کی زندگی دیہی علاقے کے اس خاندان کا مرثیہ ہے جس پر نوحہ پڑھنے والا بھی کوئی نہیں بچا ہے حالت یہ ہے کہ زمیندار بھی حالات کا فائدہ اٹھا کر ہرکھو کی جائداد کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہے۔

پریم چند کے افسانے "مشعل ہدایت"، "بانکا زمیندار"، "پوس کی رات"، "بڑے گھر کی بیٹی"، "دودھ کی قیمت"، "کفن" اور "بیٹی کا دھن" گاؤں پر لکھے ان کے اہم افسانے ہیں۔ پریم چند نے گاؤں کی عکاسی میں بڑے کارنامے انجام دیے۔ انھوں نے گاؤں کو مستقل موضوع کی حیثیت دی اور گاؤں کو اخلاقی برتری کی علامت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے افسانوں میں خیر و شر کی آمیزش بے حد نمایاں ہے۔ یہ پریم چند ہی ہیں جن کے افسانوں میں ہندوستانی معاشرہ اپنے تمام تر مسائل اور رویوں کے ساتھ

نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

علی عباس حسینی، سدرشن اور اعظم کریوی نے پریم چند کی روش اختیار کی۔ علی عباس حسینی نے شروع میں رومانیت کے اثر کو قبول کیا تھا اور "جذب کامل"، "رفیق تنہائی" میں رومانیت کا اثر غالب بھی ہے لیکن اس کے بعد انھوں نے "آئی سی ایس، باسی پھول" وغیرہ میں بالکل نیا انداز اپنایا۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہوئے مزدوروں اور کسانوں کے بنیادی مسائل اپنے افسانوں میں پیش کرنے لگے تھے۔ کہیں کہیں اوسط طبقے کی ذہنی الجھنوں کا بیان بھی افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔

پنڈت سدرشن کے افسانوں میں گاؤں کی سماجی بیداری کے نقوش واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اعظم کریوی کا گاؤں لاچاری اور مجبوری کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں محبت اور ملائمیت کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے گاؤں کی معصومیت کو مثالی انداز عطا کیا تو غربت اور بے چارگی پر بھی آنسو بہائے ہیں۔ اعظم کے یہاں گاؤں ایک خود کفیل کائنات ہے۔ یہاں کا کردار حالات سے گھبرا کر شہر کا رخ نہیں کرتا بلکہ گاؤں میں ہی رہ کر قسمت آزمائی کرتا ہے۔ افسانہ "مایا" ایک ایسی بیوہ کی کہانی ہے جو کہ ۲۲ سال کی عمر میں بیوہ ہو جاتی ہے اور اپنے داخلی احساسات کی بھٹی میں تپ کر دو اپنی بہن کے شوہر کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اعظم کریوی نے انسانی مجبوری اور بے بضاعتی کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

علی عباس حسینی، سدرشن اور اعظم کریوی وغیرہ کے مقابلے زیادہ طبع ذہن اور جدت پسند تھے اس لیے انھوں نے پریم چند کی راہ کو قبول تو کیا لیکن ساتھ ساتھ اپنے فن کے ذریعے نئی راہ بھی نکالی۔ پریم چند نے نچلے طبقے کو نیکی کا مظہر جانا تھا لیکن علی عباس حسینی نے گاؤں کے اونچے طبقے کے کرداروں میں خیر کے نقوش تلاش کیے۔ پریم چند کے افسانوں میں جنسی جذبہ کے ابھار پر وہ شادی کو بطور ٹول (Tool) کو استعمال کر لیتے ہیں لیکن حسینی کے یہاں جنس زندگی کی حقیقت ہے وہ جنس کی پیشکش بلا روک ٹوک کر جاتے ہیں۔ "میلہ

گھومنی' افسانہ میں، بنجارن شادی کے بعد بھی جوانی کے بند کو باندھنے میں ناکام رہتی ہے۔ میر صاحب جو کہ گاؤں میں اونچی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ گاؤں کے معاشرتی اخلاق کے محافظ ہیں اور معاشرہ کی ہر کروٹ کو بھی پہچانتے ہیں لیکن وہ، بنجارن کے مزاج کو نہیں بدل پاتے اور، بنجارن دو خاوندوں کی موت کے بعد ایک نوجوان کے ساتھ میلہ گھومنے چلی جاتی ہے:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا"۔

اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ چھو کی فاتحہ کے تیسرے دن
اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک نوجوان کے ساتھ کنبھ
کا میلہ گھومنے الہ آباد چلی گئی"۔

(اردو کلاسک، جلد نمبر ۱، ممبئی ص ۳۳)

پریم چند کی طرح سدرشن قوم پرست تھے اور ان پر گاندھی جی کے اثرات صاف دکھائی دیتے تھے انھوں نے ہندوؤں کے سماجی مسائل کو زیادہ ہمدردانہ رویے کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ غربت، افلاس اور تنگ دستی ان کے گاؤں کے افسانوں کے اساسی موضوعات ہیں۔ انھوں نے بیواؤں کی شادی، اچھوتوں سے ہمدردی، دیہات سدھار، چھوٹی عمر کی شادیوں وغیرہ موضوعات پر عمدہ افسانے لکھے ہیں۔

ابوالفضل صدیقی نے گاؤں کے مختلف مسائل کے ساتھ دیہی زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا اور وقیع مشاہدہ کی بنا پر افسانے تخلیق کیے۔ ہر چند کہ ان کے افسانے طویل ہوتے ہیں لیکن ان میں گاؤں کی فضا، منظر کشی اور ماحول کے ساتھ تہذیب بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ابوالفضل صدیقی فصل کی کاشت، شکار، باغبانی سے لے کر دیہی زندگی کے اندر پنپنے والے جنسی معاملات اور گاؤں کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف افسانے لکھتے رہے۔ ان کے یہاں پیٹ کی بھوک کے ساتھ جنسی اور مذہبی بھوک کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ باپ، جوالا مکھ، ستاروں کی چال، گلاب خاص، گرد ہا ہو جائے، ممتا کا ٹکراؤ، چھلانگ وغیرہ ان کے دیہی پس منظر میں لکھے گئے اہم افسانے ہیں۔ ابوالفضل

صدیقی نے زیادہ تر روہیل کھنڈ کے گاؤں کی زندگی اور یہاں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے لیکن ان کی فن کارانہ پیش کش کا کمال یہ ہے کہ یہ اکثر کسی مخصوص علاقہ کی جگہ ملک کے ہر گاؤں کی تصویر پیش کر دیتے ہیں۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں اختر اورینوی اچھے مشاہدہ کے ذریعے خارجی اور داخلی قسم کی مصوری کے ماہر تو تھے ہی ساتھ ہی کردار نویسی بھی ان کے فن کا خاصہ ہے۔ اختر اورینوی کے ان افسانوں کو کامیابی ملی جس میں بہار کی دیہی زندگی کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔ بہار کے سرد گرم اور طوفانی موسم، قحط، زلزلے اور سیلاب کی تباہ کاریوں سے جوجھتے۔ انسان کی قدرت کے سامنے بے دست و پا، بے بس زندگی اور اس کے جذبات و احساسات کو اختر اورینوی نے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بہار کے کسانوں کے بنیادی مسائل کو اختر اورینوی نے بڑے ہی حقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا بھی صوبہ بہار سے تعلق ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے پہلی کانفرنس کے بعد وابستہ ہوئے وہ میں بھی بہار کی دیہی زندگی کی عکاسی کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ پریم چند کے افسانوں کی مہک ان کے افسانوں میں بھی محسوس ہوتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا افسانہ "الاؤ" گاؤں کی سیاسی بیداری کے اردگرد بنا گیا ہے۔ افسانہ میں گاؤں کی استحصالی طاقتوں کے نرغے میں پھنس کر الاؤ کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اس افسانے میں پٹواری استحصال کا نمائندہ اور منفی قوت کی علامت بن جاتا ہے۔ گاؤں کے محنت کش کسانوں میں جرأت پیدا ہو رہی تھی وہ اپنی بدحالی کو خوش حالی میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھنے لگے تھے۔ پریم چند کے دور میں کاشت کاروں میں جو اتحاد پیدا نہیں ہو سکا تھا وہ اب سہیل عظیم آبادی کے یہاں پیدا ہو چکا تھا۔ "الاؤ" میں سہیل عظیم آبادی نے کسانوں کی فطری کوتاہیوں کی کھل کر نشان دہی کی ہے۔ روٹی کا ٹکڑا، سرلا کا بیاہ، مصنف کی زندگی اور جہیز وغیرہ افسانوں میں بھی سہیل عظیم آبادی غریبوں کے ہمدرد اور بہی خواہ نظر آتے ہیں۔

کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے بڑے افسانہ نگار تسلیم کیے گئے ہیں۔ وہ پریم چند اسکول کی حقیقت نگاری سے قدر مختلف رجحان کی طرف مائل ہوئے۔ ''طلسم خیال'' سے ''دسواں پل'' تک مختلف مجموعوں میں کرشن چندر نے کشمیر کے دیہات کی زندگی، یہاں کی بھوک اور غربت کو موضوع بنا کر افسانے لکھے۔ کرشن چندر نے مربوط پلاٹ کے افسانے لکھنے پر زور نہیں دیا۔ کرشن چندر نے محبت کے جنسی زاویے کو ابھارا اور اسے بالواسطہ طور پر پیٹ کی بھوک سے جوڑ دیا۔ ان کے افسانوں میں فطرت ایک زبردست اور پراسرار قوت کے روپ میں ابھرتی ہے۔ کرشن چندر نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاؤں کی بعض اقدار کے خلاف آواز بلند کی۔ کرشن چندر کے کردار عموماً سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنجہانی، زندگی کے موڑ پر، پورے چاند کی رات، گرجن کی ایک شام وغیرہ کرشن چندر کے اہم افسانے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے دیہات کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے انھوں نے ان دیہی علاقوں کی زندگی، اس کے مسائل کے ساتھ تقسیم کے بعد کے مسائل اور قیام پاکستان کے بعد کے دیہات کی پیش کش سے افسانوی کینوس پر رنگ اُکیرے ہیں۔ پنجاب کی خوبصورت سرزمین وہاں کی چھوٹی چھوٹی ندیاں اور چراگاہیں اور وہاں پیدا ہونے والے مخصوص قسم کے پیڑ پودے اور جھاڑیوں کا ذکر ان کے افسانوں میں خوب ملتا ہے۔ اس پس منظر میں پنجابی دوشیزہ کا حسن ان کے افسانوں کو دل کشی بخشتا ہے۔ ندیم نے کسانوں کی زندگی کو بھی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''بگولے'' کسانوں کی دنیا کا نئی جہت سے مطالعہ کرتا ہے۔

حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں زندگی کی سفاک حقیقت کو غیر جانب داری کے ساتھ سادگی سے پیش کیا ہے۔ حیات اللہ انصاری کا شاہ کار افسانہ ''آخری کوشش'' گاؤں کے پس منظر میں پروان چڑھتا ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اس افسانے میں گاؤں کا حسی مطالعہ بڑی باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے گھسیٹے اور فقیرے

کے کرداروں کے ذریعے محروم انسانوں کی جذبات نگاری حقیقی انداز میں کی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانوں میں سماج کے کچلے ہوئے طبقے کو اس کے واجب سیاق و سباق میں حقیقی خدوخال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پریم چند کے ''کفن'' کی طرح حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''آخری کوشش'' بھی زندگی کے سفاک اور بے رحم مراحل سے گزرتا ہے۔ افسانہ میں گاؤں کی روح جس فنی چابک دستی سے پیش کی گئی ہے اس نے حیات اللہ انصاری کو گاؤں کی عکاسی میں اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں بھی گاؤں کی عکاسی فن کارانہ انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ بیدی کے فن میں ''بھولا'' سے لے کر ''ایک باپ بکاؤ ہے'' تک فنی ارتقاء نظر آتا ہے انھوں نے ان افسانوں میں موضوعاتی طور پر گاؤں سے قصبے اور قصبے سے شہر کی طرف سفر کیا ہے۔ بیدی کے افسانوں میں کسانوں اور محروم انسانوں کا درد صاف طور پر نظر آتا ہے بیدی سماجی نابرابری کو پیش کرتے وقت بھی رومانی پہلو متوازن انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بیدی گاؤں اور اس کی معاشرت زندگی کے دو متضاد رویوں کو گرفت میں لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ پہلے کی مثال ''بھولا'' ہے جو کہ ایک دیہاتی بچے کی کہانی ہے۔ جو کہ دن میں کہانی سننے پر ماموں کے راستہ بھول جانے جیسے مفروضے کو سچ کر دکھاتا ہے۔ بیدی کا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی ظاہر حقیقتوں کے ساتھ ساتھ اس کی پرت در پرت زیریں صداقتوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ بیدی بچوں کی نفسیات کے علاوہ عورت کے سماجی، جنسی اور رومانی رویوں کو بھی مہارت کے ساتھ پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ بیدی کے دیہاتی افسانوں میں دیہی افراد معصومیت کے غلاف میں لپٹے ہوتے ہیں افسانہ ''من کی من میں'' دیہاتی معاشرہ کے روشن اور تاریک پہلو جڑواں نظر آتے ہیں۔ بیدی کے دیہی افسانوں کی تعداد تو زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے افسانوں کی پرخلوص سادگی دیہاتی معاشرہ کی عطا کردہ معلوم ہوتی ہے۔

بلونت سنگھ نے اپنے دیہی افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کے بدحال

کسانوں، جابر زمین داروں کو پیش کیا ہے۔ زراعت کے صدیوں پرانے طریقے جاگیردارانہ معیشت، جہالت، مفلسی اور ان سے پیدا ہونے والا دباؤ جو کہ انسان کو جرائم کی طرف لے جاتا ہے بلونت سنگھ کے افسانوں میں موجود ہے۔ تین چور، پکا اور گرنتھی جیسے افسانے انہی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔

بلونت سنگھ نے پنجاب کے گاؤں کو اس کے اصل رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ دیہات کی عکاسی اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''دھوپ ہلکی پڑ چکی تھی لیکن گرمی اب بھی کافی تھی۔ سڑک بڑے کھیتوں سے ہو کر جاتی تھی۔ راستے میں سڑک سے ذرا پرے ہٹ کر جابجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ کنووں کا صاف و شفاف پانی۔ چھالوں میں گرتا ہوا کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ان کنووں کے گرد قینچی سے کترے ہوئے داڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کے تہ بند باندھے بڑے سرور کے عالم میں حقے گڑگڑاتے نظر آئے۔''

(افسانہ البیلا)

بلونت سنگھ دیہاتی زندگی کی ان حقیقتوں کے ترجمان ہی جن کی تہذیب ابھی تک پامال نہیں ہوئی۔ ان کے افسانوں کے کردار اپنی قوت بازو پر بھروسہ رکھنے والے انسان ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد کی افسانہ نگاری کے دیہات کی عکاسی کرنے والوں میں ہرچرن چاولہ کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں میاں والی کے وہ دیہات آباد کیے ہیں جہاں سوال کی زبان چاقو اور جواب کی زبان پستول ہے۔ اس گاؤں کے نوجوان کا میکہ گاؤں ہے لیکن سسرال جیل ہے۔ یہاں لڑکا جوان ہوتا ہے تو جب تک قتل اور اغوا کی دو چار وارداتیں نہ کرلیں گاؤں والے اس کی جوانی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ہرچرن چاولہ نے شہر اور دیہات کی خارجی آمیزش کو نمایاں کرنے کے علاوہ دیہات کی داخلی کش مکش کو بھی

اپنا موضوع بنایا ہے اور طبقاتی تضاد کو ابھارنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے جنسی برتری کو دیہاتی قوت کا نمائشی پہلو قرار دیا ہے۔ ''دوسرا اور آخری قدم سے پہلے'' افسانہ اس کی عمدہ مثال ہے۔ جدید افسانے کے دور میں بھی دیہات کو اہمیت حاصل رہی ہے۔

سریندر پرکاش کا افسانہ ''بجوکا'' دیہی ماحول کا بہترین عکاس ہے افسانہ میں چوکیداری کی علامت نہایت معنی خیز ہے۔ یہ کردار ایک تلخ حقیقت کو صداقت کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ یہ افسانہ علامتی انداز میں دیہاتی زندگی کے متعدد زاویے اور بے شمار معنی سمیٹے ہوئے ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو افسانے میں گاؤں کی عکاسی میں بالخصوص علامت کا اتنا عمدہ استعمال پہلے نہیں ہوا تھا۔

جوگیندر پال کے افسانوں میں گاؤں کی عکاسی کی بہترین مثال ''بازدید'' ہے جس میں جوگیندر پال اپنی گم شدہ جنت کی بازیافت کرتے ہیں۔ یہ گم شدہ جنت ان کا گاؤں ہے ''بازدید'' گاؤں کی عکاسی کا ایک نیا زاویہ پیش کرتا ہے جو کہ جدیدیت کی طرف جوگیندر پال کے قدم بڑھانے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔

غیاث احمد گدی کا افسانہ ''رونے کی آواز'' دیہات کی پاک مٹی کے خمیر سے اٹھا ہوا افسانہ ہے۔ انھوں نے گاؤں کی جو فضا قائم کی ہے اس میں تذبذب بھی ہے اور بے یقینی بھی۔ غیاث احمد گدی اپنے افسانے کو خوبصورتی کے ساتھ منطقی انجام تک پہنچاتے ہیں اور قاری پر ایک نیا جہان معنی کھلتا جاتا ہے۔

رتن سنگھ کا افسانہ ''پچھتاوا'' گاؤں کی عکاسی کا بہترین نمونہ ہے رتن سنگھ چھوٹے چھوٹے جملوں، محدود کینوس میں لامحدود باتیں کہہ دینے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے یہاں بڑی تخلیقی صلاحیت ہے اور وہ تجربات کا بھی پورا اعادہ کرتے ہیں۔

انجم عثمانی نے پریم چند کی روش کو نئے لہجے کے ساتھ اختیار کیا ہے دیہاتی زندگی کی عریاں تصاویر کے منظر ان کے افسانوی مجموعہ ''شب آشنا'' میں موجود ہیں۔ گناہ کی واپسی، آخری نوٹ، مکتی اور ناسور وغیرہ اسی حقیقت پر مبنی عمدہ افسانے ہیں۔

ممبئی کے افسانہ نگار اشتیاق سعید نے متعدد افسانے لکھے ہیں جن میں دیہی زندگی کی بچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اشتیاق سعید کے افسانوی مجموعے "کل جوتا" اور "حاضر غائب" شائع ہو کر بڑے مقبول ہوئے ہیں ان مجموعوں میں شامل افسانوں میں انھوں نے مشرقی یوپی کے دیہات کے مسائل کی بخوبی عکاسی کی ہے۔ بھوجپوری الفاظ ان کے افسانوں کی زبان کی خاصیت ہیں۔ سوکھا، سیلاب، کسانوں کی مصروفیات، باہمی رشتوں میں انسیت، اخوت اور کش مکش ان کے افسانوں میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔

اشرف جہاں کا تذکرہ کیے بغیر یہ مضمون تشنہ رہے گا۔ اشرف جہاں نے "نرملا" افسانے کو آج کے پس منظر میں نہایت فن کارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ "آج کی نرملا" رسالہ "شاعر" میں شائع ہونے والا اور بین التونیت کی روایت کا بہترین افسانہ ہے۔ اشرف جہاں نے بھی دیہی روایت سے خود کو مضبوطی کے ساتھ منسلک رکھا ہے ان کے یہاں دیہاتی رشتوں کی تپش خاص موضوعات میں شامل ہے۔

ان سب کے باوجود اردو کے بہت سے نامور افسانہ نگار ایسے ہیں جن کے یہاں دیہات کے مسائل اور دیہی زندگی کے متعلق موضوعات پر مستقل افسانے تو نہیں ملتے، تاہم بعض نے اس کی اہمیت کو پہچانا اور اس موضوع پر کچھ افسانے تخلیق کیے۔ گربچن سنگھ کا افسانہ "کنیادان"، سلام بن رزاق کا افسانہ "کام دھینو"، عشرت ظہیر کا "تیسرا لمحہ" وغیرہ افسانے قابل ذکر ہیں۔ عجب اتفاق کہیے یا اردو زبان کی کم نصیبی کہ اس کا رشتہ دور جدید میں گاؤں کے ساتھ بڑی حد تک استوار نہیں رہا ہے اردو افسانہ ۱۹۶۰ء تک گاؤں کا جس طرح عکاس تھا ویسا بعد میں نہیں رہا۔ جب کہ آج بھی ہندوستان کی زندگی گاؤں سے ہی عبارت سمجھی جاتی ہے۔

☆☆

اسلم جمشید پوری کے افسانوں میں دیہات

اسلم جمشید پوری کا شمار دور حاضر کے کامیاب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے جن موضوعات پر افسانے لکھے ہیں وہ نہ صرف شہر بلکہ گاؤں کے مسائل کو بہ خوبی متعارف کراتے ہیں۔ اسلم جمشید پوری نے فنی لوازمات کا لحاظ رکھتے ہوئے افسانے لکھے ہیں جس کی وجہ سے افسانے نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سماجی، عصری مسائل کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ جس نوع کے افسانہ نگار ہیں اس میں افسانوں کا Catagrization تو ممکن نہیں پھر بھی الجھن کو دور کرنے کے لیے موٹے طور پر دو زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ افسانے جو شہر کی زندگی اور اس کے مسائل پر مبنی ہیں اور دوسرے وہ جو پریم چند کی روایت کا حصہ ہیں ساتھ ہی دیہی مسائل اور دیہی زندگی کے عکاس ہیں۔

اسلم جمشید پوری نے دیہی زندگی کے تعلق سے جو افسانے تخلیق کیے ہیں ان میں سے "لینڈرا"، "عیدگاہ سے واپسی"، "شبراتی"، "بدلتا ہے رنگ"، "دن کے اندھیرے رات کے اجالے"، "اندھیرا ابھی زندہ ہے"، "نہ بجھنے والا سورج" وغیرہ اہم افسانے ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف مقبولیت حاصل کی ہے بلکہ ادب میں بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان تمام افسانوں میں گاؤں کی زندگی کے مختلف شیڈ پیش کیے گئے ہیں جس طرح کی حقیقت نگاری

ان افسانوں میں دکھائی دیتی ہے وہ ان افسانوں کو پریم چند کی روایت کا حصہ بنا دیتی ہے۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے ان افسانوں میں اکثر انہی تکنیک کو اپنے انداز میں برتا ہے جو کہ پریم چند کا خاصہ ہیں۔ان افسانوں کا اختتام بھی تقریباً اسی اسٹائل میں ہوتا ہے جیسا کہ پریم چند نے اپنے بہت سے افسانوں کا اختتام کیا ہے۔مثلاً

''ہائے اللہ.........''

ایک دلدوز ودلخراش چیخ کے ساتھ شبراتن شبراتی کے بے جان جسم سے لپٹ گئی۔ اس کے دونوں بچے بھی روتے ہوئے لاش پر لوٹے پڑ رہے تھے۔

گاؤں والوں کی زبانوں پر تالے پڑ گئے تھے۔ان کے سروں پر مانو منوں بوجھ تھا کہ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔گاؤں سے دکھ نکل گیا تھا۔

شبراتی کے دونوں بچے اپنی ماں کا دامن کھینچ رہے تھے گویا کہہ رہے ہوں، ماں ہمارے گھر میں گھسے دکھ کو کون نکالے گا.......؟''

(کہانی محل۔ص 98)

''لینڈرا'' اسلم جمشید پوری کا نہایت اہم افسانہ ہے جو کہ لینڈرا کے کردار کی ذہنی و فکری کشمکش اور اس کے نفسیاتی پہلو پر اس انداز میں روشنی ڈالتا ہے کہ دیہی زندگی کا مکمل سچ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔افسانے کا تانا بانا نہایت چابک دستی کے ساتھ بنا گیا ہے۔ کہانی ایک ربط کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور جزئیات ومفاہیم کی دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ لینڈرا کا کردار اسلم جمشید پوری کے عمیق مطالعہ ومشاہدہ کی طرف اشارہ کرتا ہے چونکہ لینڈرا کے حقیقی کردار سے اسلم جمشید پوری کا واسطہ پڑ چکا تھا اس لیے کردار کی پیش کش اور زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔ لینڈرا پر ہونے والے ظلم، اس کے خلاف لینڈرا کا بے نیازانہ عمل اور پھر اچانک خودی کے جاگنے پر خود کو انسانی جبلت کے عین مطابق پیش کش نے لینڈرا

کو آفاقی کردار بنا دیا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''کون ہے......؟

آواز کلوا کے ماموں کی شادی شدہ بہن کی تھی۔ جو شادی میں شریک ہونے ایک ہفتے سے آئی ہوئی تھی۔

''میں......میں......''

''میں کون......لینڈرا......''

''ہاں......چلم بھرنے آیو تھو۔(آیا تھا)''

لینڈرا کہنے پر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی گویا چلم کی آگ نے اس کے بدن کے ہتھے کو سلگا دیا ہو۔نجانے کیوں وہ ایک عورت کے منہ سے لینڈرا سن کر جل گیا تھا۔''

(کہانی محل۔ص 32)

لینڈرا کے ذریعے اسلم جمشید پوری نے اس گاؤں کی زندگی کی بہترین عکاسی کی ہے جو کہ دلہن کے ساتھ جہیز میں آئے بچے کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے کو تیار نہیں ہے۔ لینڈرا ایک چڑھ بن جاتی ہے اور فقیر محمد ''لینڈرا'' کے نام سے ہی مشہور ہو جاتا ہے۔مصنف نے ''لینڈرا'' کے آغاز میں لینڈرا کو بے ضرر اور شریف النفس انسان بنا کر پیش کیا ہے جو کہ موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کرتا اور بے نیازی کے ساتھ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کر برداشت کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پورے گاؤں کا بے اجرت مزدور بن جاتا ہے۔گاؤں کی عورتیں اور نوجوان لڑکیاں بھی اس سے خوب گھلی ملی رہتی تھیں اور تمام ظاہر اور خفیہ کام بھی کرواتی رہتی تھیں:

''گاؤں کی عورتیں جن میں بزرگ عورتیں بھی شامل تھیں اور نوجوان لڑکیاں اور بہوئیں بھی۔سب لینڈرا سے ایسے گھلی ملی تھیں جیسے لینڈرا انھیں کی نسل کا ہو۔کسی کو لینڈرا کے مرد ہونے کا یقین نہیں

تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں اپنی خفیہ باتیں بھی کر لیتیں۔ بغیر دوپٹے اس کے سامنے آجاتیں۔ لینڈرا سے نہانے کا گرم پانی غسل خانے میں رکھوا لیتیں۔ کبھی کبھی ہاتھ پاؤں بھی دبوا لیتیں"۔

(کہانی کل 30)

لینڈرا کا بے ضرر اور مخلصانہ رویہ دراصل گاؤں کے مرد عورتوں کو بے حس بنا دیتا ہے اور وہ اس کی نفسی خواہشات کی طرف سے اس قدر لاپرواہ ہو جاتے ہیں کہ گھر والے اس کی شادی تک کے بارے میں خیال نہیں کرتے۔ سب خود ساختہ طور پر مان لیتے ہیں کہ لینڈرا شادی کے لائق ہی نہیں ہے؟ یہی بات لینڈرا کے ذہن میں ٹھہر جاتی ہے۔ پھر جب اس کے بھائی کلوا کی میری بہن اس کو 'لینڈرا' کہتی ہے تو اس کے اندر کا مرد جاگنے لگتا ہے۔ وہ جب اس کی ٹانگیں دبانے لگتا ہے تو پہلی مرتبہ اسے اپنے اندر جنسی تلذذ کا احساس جاگتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جب کلوا اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس سے دوبارہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو حلالہ کے لیے لینڈرا کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ لینڈرا کا نکاح ہو جاتا ہے اور اسے حجلۂ عروسی میں رات گذارنے کے لیے بند کر دیا جاتا ہے انسانی فطرت کے عین مطابق اچانک لینڈرا کے اندر دبی نفرت کی چنگاری سلگ اٹھتی ہے وہ اپنے اوپر ہوئے ظلم کو یاد کرتا ہے اور گاؤں والوں کے ساتھ کیے گئے وعدوں پر غور کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن بیدار ہوتا ہے۔ اس کے اندر شادی کی پہلی رات کا تجسس، ظلم کے بدلے کی چنگاری، جنسی تلذذ کی خواہش جیسے جذبات ایک ساتھ ابھرتے ہیں۔ انہی جذبات سے مغلوب ہو کر وہ خود کو مرد ثابت کر دیتا ہے۔

"لینڈرا" افسانے کا پورا ماحول دیہی زندگی کا نمونہ ہے اسلم جمشید پوری نے اس افسانے میں جزئیات پر خاصا زور دیا ہے۔ انھوں نے گاؤں کی تہذیب اور فضا کی بڑی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ فقیر محمد عرف لینڈرا کے پیچیدہ کردار میں بڑی جاذبیت ہے۔ وہ جب انتقام بھی لیتا ہے تو قاری اس کے عمل کو ہمدردی کے ساتھ دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ سماج

ہی تو ہے جس نے اس کی طرف سے بے حسانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا اور اسے توڑنے کی صورت شاید اس کے پاس کوئی اور نہیں تھی۔ افسانے کا پلاٹ مربوط ہے جس کی وجہ سے تجسس کی فضا مسلسل برقرار رہتی ہے۔ حالانکہ انتقام بے حد فطری ہے۔ آخری حصے میں لینڈرا کے پھر سے فقیر محمد بن جانے کے احساس اور ذہنی کشمکش کو اسلم جمشید پوری نے خوبصورت بیانیہ کے ذریعے پیش کیا ہے۔ لینڈرا نے مواقع ملنے کے باوجود بھی گناہ نہیں کیے تھے جس کی وجہ سے اس کے بارے میں غلط فہمی یا یوں کہیں کہ بے حسی کا رویہ عام ہو گیا تھا۔ انتقام پر وہ اپنے جائز حق کا استعمال کر کے نہ صرف خود کو مکمل مرد ثابت کر دیتا ہے بلکہ کیا ہوا وعدہ بھی نبھا دیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"کتنا اطمینان ہے حرام زادی کے چہرے پر...... کیوں ہے یہ اطمینان، صرف اس لیے نا کہ میں لینڈرا ہوں۔ لینڈرا جو شاید مرد نہیں ہوتا۔ گاؤں کی ساری عورتیں مجھے یہی سمجھتی ہیں نا۔ انھیں یہ نہیں پتہ لینڈرا، مرد ہے، لیکن بدکردار نہیں۔ کبھی کسی لڑکی کو نہیں چھیڑا، کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں مرد نہیں...... نامرد ہوں۔ سارے گھر کو، پورے گاؤں کو اطمینان ہے۔ سب مجھے نامرد سمجھتے ہیں...... آؤ، گاؤں والو دیکھ لو...... میں نامرد نہیں ہوں۔

رات کے پچھلے پہر لینڈرا کے کمرے سے ابھرنے والی چیخوں اور کراہوں نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد لینڈرا، نہیں فقیر محمد، جو آج بادشاہ وقت سے کم نہ تھا، نے حسب وعدہ گہنا چکے چاند پر اپنے دروازے ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیے۔"

(کہانی کل۔ص 38)

"شبراتی" افسانہ اسلم جمشید پوری کا دیہی پس منظر میں لکھا گیا ایسا افسانہ ہے

جو کہ گاؤں کے سیدھے سادے عوام میں اندھ وشواس اور ٹونے ٹوٹکے کے ذریعے مسائل کا حل نکالنے کی کوششوں پر چوٹ کرتا ہے۔ 'شبراتی' کا مرکزی کردار شبراتی ہے جو کہ مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور گاؤں سے دکھ نکلوانے کی خاطر خود کی جان گنوا دیتا ہے۔ افسانہ کا آغاز گاؤں کے لوگوں کی اس فکر کے ساتھ ہوتا ہے کہ ان کے جانور کسی نامعلوم بیماری کی وجہ سے مرتے جا رہے ہیں گاؤں والے اس بیماری سے نجات پانے کے لیے طوفانی رات میں شبراتی کو گاؤں سے باہر دکھ سے بھرے گھڑے کو دفنانے بھیج دیتے ہیں۔ شبراتی گاؤں سے دکھ نکالنے کی خاطر اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اس مشن پر جاتا ہے۔ اس مشن میں اس کے ساتھ بھیجے گئے دوسرے لوگ طوفانی بارش سے گھبرا کر چپ چاپ اسے اکیلا چھوڑ کر گاؤں واپس چلے آتے ہیں لیکن شبراتی کام کو کامیابی کے ساتھ مکمل کر کے واپس لوٹتے وقت ٹیوب ویل کی نالی میں گر کر ڈوب جاتا ہے اور اس کی موت ہو جاتی ہے۔ افسانے کا اختتام قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ پورے گاؤں کے دکھوں کو ختم کرنے والے کے گھر میں در آئے دکھ کو اب کون نکالے گا۔ شبراتی کی لاش کے پاس شبراتن اور اس کے دونوں بچے بین کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں سوال کرتی ہیں جس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ اسلم جمشید پوری نے افسانے کو فنی چابک دستی کے ذریعے نہایت متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے۔ ہندو اکثریتی گاؤں میں مسلمان شبراتی کو ہی کیوں اس خطرناک کام کے لیے چنا جاتا ہے یہ واضح نہیں ہو پاتا۔ افسانے میں اندھے یقین کی روایت، طوفانی رات کا بیان اور منظر کشی کو بہترین ڈسکرپشن کہا جا سکتا ہے جو کہ افسانہ کے بیانیہ کو بڑی تقویت دیتا ہے۔ یہ افسانہ آج کے حالات میں بھی بے حد موثر افسانہ ہے جو کہ گاؤں کی زندگی میں پنپنے والے اندھ وشواس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔ افسانے کی زبان میں برج بھاشا کا اثر دکھائی دیتا ہے جو کہ گاؤں دھنورا (بلند شہر) کی عام بول چال سے میل کھاتا ہے۔ افسانے کے مکالمے فطری ہیں جو کہ گاؤں کی زبان میں ہی پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

"رات تاریک تھی۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ آسمان

کالے کالے بادلوں سے بھرا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج ماحول کو پر ہول بنا رہی تھی۔ ملکھان سنگھ کی بیٹھک پر گہما گہمی تھی۔ گاؤں کے نوجوان اور بوڑھے جمع تھے۔ شبراتی نے سر پر منڈاسہ (پگڑی) اور دھوتی کو لنگوٹ کی صورت پہن رکھا تھا۔ اس کے پورے جسم پر کالی سیاہی ملی ہوئی تھی۔ چہرہ بھی کالک سے پوت دیا گیا تھا۔ دس ہٹے کٹے نوجوان بھی کچھ اسی قسم کا حلیہ بنائے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں لاٹھی اور بلم تھے۔ تیاری مکمل تھی۔ بس مکھیا کی اجازت دینے کی دیر تھی"۔

(کہانی محل۔ ص94)

شبراتن کے کچھ مکالمے ضرور اپٹے محسوس ہوتے ہیں جیسے:

"اے اللہ میرے پتی کو سکُھل واپس لائیو"

مسلمان گھروں کی خواتین اس زبان کا استعمال گاؤں میں بھی نہیں کرتی ہیں۔ زبان کے معاملے میں یہ اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ کچھ ادیب ہندی الفاظ کے زیادہ استعمال کو بھی برا نہیں مانتے جب کہ زیادہ تر کی رائے ہے کہ اردو زبان لکھتے وقت صرف اسی حالت میں غیر زبان کا لفظ استعمال کیا جائے جب کہ اس کا متبادل اردو میں موجود نہ ہو۔ لیکن گاؤں کی زبان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس پر برج اور کھڑی بولی کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اس کے سبب ہندی کے الفاظ اور گتو، آگو، میرو پتی جیسے الفاظ بھی افسانے میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسلم جمشید پوری نے شبراتی کے کردار میں حقیقت کے خوب رنگ بھرے ہیں۔ اس کے کردار کی مضبوطی اسے آئڈیل کردار بنا دیتی ہے جو کہ اپنے کام کے لیے خود کو پوری طرح وقف کر دیتا ہے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کے لیے اس کی عقیدت دور حاضر کے مشترک تہذیب والے گاؤں کے لیے مثال بن جاتی ہے۔

"مکھیا جی کی رہنمائی میں سارا گاؤں پنڈت گوپال کے کھیت

کی طرف چل پڑا۔ چاروں طرف پانی کی حکومت تھی۔ گوپال کا کھیت بھی پانی سے لبالب تھا۔ شبراتی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اچانک کسی کے زور سے چلانے کی آواز آئی۔

"شب.........شبراتی.........!!

سب اس طرف لپکے۔ جمن کا سرکاری نالی پر کھڑے تھے۔ وہاں شبراتی کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس کا جسم پھول کر کافی موٹا ہو چکا تھا۔ جابجا کا لک لگا اس کا جسم بہت ہی ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ نالی کے گہرے پانی سے بڑی مشکل سے اس کی لاش کو نکالا گیا۔ لوگوں کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے"۔

(کہانی محل۔ ص 98)

"عیدگاہ سے واپسی" بین المتونیت کی عمدہ مثال ہے۔ پریم چند کے افسانے 'عیدگاہ' کو اسلم جمشید پوری نے آگے بڑھایا ہے اور اسے دورِ حاضر کے حالات میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پریم چند کا 'حامد' دادی کی موت کے بعد پڑوس کے بابا سکھ دیو کی گود میں پرورش و تربیت پاتا ہے۔ وہ اب 70 سال کا بوڑھا ہو چکا ہے اور تیزی سے بدلتے معاشرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ تب کے گاؤں اور اب کے گاؤں کے فرق کو واضح طور پر محسوس کرتا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے شہری مشترک تہذیب اور گاؤں کی مشترک تہذیب کے درمیان کے فرق کو اس افسانے کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ شہر میں ہندو مسلم فساد ہوتا ہے اور اس میں میاں حامد کا بیٹا واحد اپنے ساتھی ہندو مزدوروں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے لیکن جب اس کی لاش گاؤں آتی ہے تو تمام ہندو نہ صرف خود کو اس کے قتل کا ذمہ دار تصور کرتے ہیں بلکہ اس کے دفن کا انتظام بھی خود ہی کرتے ہیں۔ اسلم جمشید پوری ان واقعات کے ذریعے شہر میں فرقہ وارانہ منافرت اور گاؤں کی فرقہ وارانہ

ہم آہنگی کے فرق کو واضح لکیر کھینچ کر سمجھا دیتے ہیں۔ دیگر دیہی پس منظر والی کہانیوں کی طرح اس افسانے میں بھی انھوں نے جزئیات اور منظر نگاری میں گاؤں کی فضا کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ افسانہ آگے بڑھتا ہے اور مختلف رنگ بدلنے لگتا ہے گاؤں کی فضا پر شہر کا رنگ چڑھنے لگتا ہے شہر کی طرح گاؤں بھی ترقی کی طرف گامزن ہیں۔ ساتھ ہی شہر کی طرح کی منافرت گاؤں کی تہذیب کو بھی آلودہ کر دیتی ہے۔ اب گاؤں میں بزرگوں کی شفقت تو موجود ہے لیکن بچوں کے دلوں میں بڑوں کی عزت ندارد ہے۔ مذہبی منافرت نے نونہالوں کے ذہنوں کو کس طرح گندہ کرنا شروع کر دیا ہے اس کا نمونہ میاں حامد کو تب دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ وہ عیدگاہ جا رہے ہوتے ہیں اور راستے میں موٹر سائیکل پر سوار بچے ان پر کچھ اس طرح طنز کرتے ہیں:

"ابے اے کوّا! کہاں جا رہے ہو.........؟"

(کہانی محل۔ ص 72)

حامد میاں جب پوتے کے ساتھ نماز سے فارغ ہو کر عیدگاہ سے واپس ہوتے ہیں تبھی کانوڑ یاترا پر نکلے ہندوؤں اور گاؤں کے مسلمانون کے درمیان فساد ہو جاتا ہے۔ یہ فساد کئی گاؤں سے ہوتا ہوا ان کے گاؤں بھی پہنچ جاتا ہے میاں حامد اور ان کا پوتا ساجد جیسے تیسے دوڑتے ہوئے گاؤں پہنچتے ہیں لیکن ٹھیک اسی طرح موت کا شکار ہو جاتے ہیں جیسے ان کا بیٹا ہوا تھا۔ مرتے وقت میاں حامد کی آنکھوں میں حیرانی تھی کہ یہ گاؤں بھی اب فرقہ وارانہ منافرت کا گڑھ بن گیا جو کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مثال تھا۔ اقتباس:

"ساجد کے جسم کو پار کرتی ہوئی گولی میاں حامد کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ گولی نے اس طرح معصوم ساجد کا جسم پار کر کے میاں حامد کو زمین کا پیوند بنا دیا تھا جیسے حرملہ کا تیر معصوم علی اصغر کے حلق سے ہوتا ہوا امام حسین کے بازو میں ترازو ہو گیا تھا۔ دونوں زمین پر آ رہے۔ خون کا فوارہ دونوں جسموں سے بلند ہو رہا تھا۔

زمین ساکت تھی۔ آسمان خاموش تھا۔ ہوا سانس لینا بھول گئی تھی۔

گاؤں کے باہر دونوں کے خون میں لت پت لاشے پڑے تھے اور تھوڑی ہی دوری پر ساجد کی کار، نازو کی گڑیا، بہو کا سوٹ، دھوتی اور چھوٹی سی پیتل کی ایک لٹیا پڑی تھی، جو میاں حامد بابا سکھ دیو کے گھر والوں کے لیے لائے تھے۔"

(کہانی محل۔ص 78)

اسلم جمشید پوری نے شہروں کے ساتھ تیزی سے گاؤں میں پاؤں پسارتے فرقہ ورانہ منافرت کے حالات کو بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے افسانے میں گاؤں کی مشترک تہذیب کو بھی پیش کیا ہے اور وقت کے گذرنے کے ساتھ گاؤں تک پہنچی منافرت کی آگ کو بھی واضح طور پر پیش کیا ہے۔ چند ماہ قبل مظفر نگر میں ہوئے فسادات نے اسلم جمشید پوری کے اس شبہ کو تقویت دی ہے کہ گاؤں بھی اب نفرت گاہ بنتے جا رہے ہیں۔

"بدلتا ہے رنگ" افسانہ دہشت گردی کو ٹول کی طرح استعمال کرنے جیسے عصری مسائل کو گاؤں کے پس منظر میں بیان کرتا ہے۔ دہشت گردی کے نام پر بے گناہ مسلمانوں کا استحصال کس طرح اس دور میں کیا جا رہا ہے اس کی بہترین عکاسی اسلم جمشید پوری نے اس افسانے میں کی ہے۔ ظفرو جو کہ ایک بہروپیہ ہے کھیل تماشے دکھا کر لوگوں کو محظوظ کرتا رہتا ہے کو پولس دہشت گرد بتا کر گرفتار کر لیتی ہے۔ افسانہ کا آغاز گاؤں میں بارات آنے سے ہوتا ہے۔ جس کو ہندو مسلم بنا امتیاز اپنے گھر کی شادی کی طرح سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ گاؤں کے بزرگ بابا اسماعیل کو بزرگ ہونے کے ناتے بارات کے استقبال کے لیے بھیجتے ہیں اس سے گاؤں کی مشترک تہذیب کا احساس ہوتا ہے۔ ظفرو بارات میں پہنچ کر گولے داغنے کے بدلے دو سو روپے ٹھگ لیتا ہے۔ اسی طرح ظفرو ہر بارات میں پہنچ جاتا ہے اور اپنے بہروپ کے ذریعے خوب پیسہ بٹور لیتا ہے۔ لیکن آخر میں وہ ڈاکوؤں کا بہروپ بنا کر میلے میں گبر کا رول نبھا رہا تھا کہ پولس اسے پاکستانی دہشت گرد بتا کر گرفتار کر لیتی ہے۔

افسانہ جس رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اس سے قاری بندھ جاتا ہے اور اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے:

"کون ہے بھئی مہندر سنگھ......" "تم نے کس کی آگیا سے دھنورہ گاؤں میں گولے داغے"

اپنی اسٹک گھماتا ہوا وہ چارپائیوں کے ادھر اُدھر غضبناک نظروں سے ایک ایک چہرے کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چھوٹے بچوں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ان کی گھگھی بندھ گئی تھی......... کسی ایک نے مہندر سنگھ کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا۔ پولس والا لپکا۔ اسٹک کو چارپائی پر مارتا ہوا دہاڑا۔

"ہاں بے سمدھی، بتا بارات نے گولے کیوں داغے۔"

"حضور گلطی ہو گئی۔ معاف کر دیو۔" سمدھی نے گھبرا کر معافی مانگ لی۔

"کوئی معافی وافی نہیں۔ جرمانہ بھرو...... لاؤ دو سو روپے نکالو۔"

(کہانی محل۔ص 117)

پلاٹ اختتام پر آ کر کچھ ڈھیلا ڈھالا ہو جاتا ہے۔ اختتام بھی کچھ غیر متوقع نہیں معلوم ہوتا۔ افسانہ جس طرح ختم ہوتا ہے اس سے قاری کو سوچنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔

"نہ بجھنے والا سورج" اسلم جمشید پوری کا ایک اور ایسا افسانہ ہے جس میں عورت کو بہت بلند کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ بانو جو کہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہے اور شوہر کے شہید ہونے کے بعد اپنے بیٹے کو بھی فوجی بنانے کا عزم پورا کرتی ہے اس افسانے کی اہم کردار ہے۔ وہ ان پڑھ ہونے کے باوجود تمام امور میں ماہر، بے حد سمجھدار اور ذمہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ حالات سے لڑنے کا قوی حوصلہ رکھتی ہے۔ افسانہ شہید کی عظمت کو تو

واضح کرتا ہی ہے ساتھ ہی گاؤں کے مناظر کی بھی دلکش عکاسی کرتا ہے۔ حب الوطنی سے عظیم کوئی جذبہ نہیں ہے اس بات کو تھیم بنا کر افسانہ لکھا گیا ہے۔ تسنیم فاطمہ امروہوی لکھتی ہیں:

''ملک پر قربان ہونے والے فوجی آخری دم تک دشمنوں کے روبرو مقابلہ کرتے رہتے ہیں کیوں کہ ان کے پیچھے ان کے جذبات کو حب الوطنی سے سرشار کرنے والی عورت کھڑی ہے۔ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ (ماں، بہن، بیوی یا دوست) کسی صورت میں ہو وہ مردوں کے حوصلے بلند کرتی ہیں۔ ان کو Inspire کرتی ہیں ان کا Mood بناتی ہیں ان کو Motivate کرتی ہیں۔ افسانہ ایک پیغام ہے بلکہ ایک سبق ہے۔ کہ صرف تعلیم کو ذہن میں رکھ انسانوں کے درمیان فاصلہ پیدا نہ کریں۔ اچھائی برائی، سمجھداری اور ناسمجھی کے معیار کا پیمانہ تعلیم کو نہ بنائیں، کیوں کہ ان پڑھ لڑکی بانو اس کہانی میں بہت سمجھدار ہے اور ذمہ دار بھی اور اس پر قابل قدر بات کہ وہ اپنے سبھی کاموں میں ماہر ہے اور ان کو بخوبی انجام دیتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی کو بھی کمتر نہیں سمجھنا چاہیے''۔

(''اسلم جمشید پوری بحیثیت افسانہ نگار۔ ایک جائزہ''۔ ص93)

رشتوں کے درد کو ٹٹولتا اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''افق کی مسکراہٹ'' گاؤں کی زندگی کے ایک مختلف زاویے کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ میں مصنف نے معاشرہ میں پھیلی برائیوں کی طرف انگشت نمائی کی ہے۔ اس میں اصلاحی پہلو بھی شامل ہیں۔ الفاظ کا نایاب ذخیرہ، مربوط پلاٹ، مکالموں کا بے باک اظہار افسانے کی خصوصیات میں سے ہیں۔ منظر نگاری عمدہ ہے جیسا کہ ان کی تمام دیہی افسانوں کی خاصیت ہے۔ افسانہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ زیادہ رونا یا زیادہ ہنسنا قابل اعتبار ماحول پیدا نہیں کرتے۔ افسانے کی زبان نہایت عمدہ ہے اور منظر کشی حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ انسانی فطرت کی عکاسی اور رشتوں

کی اہمیت پر بھی خاصا زور دیا گیا ہے۔ بظاہر گاؤں کی ایک چھوٹی سی روایت کو دھیان میں رکھ کر یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ جو کہ بہت پہلے تک گاؤں میں رائج تھی۔ ممکن ہے آج بھی کچھ گاؤں کے لوگ اس بات پر یقین کرتے ہوں کہ لال روشنائی سے اگر پتہ لکھا گیا ہے تو خبر غم کی ہی ہوگی۔ اسی تھیم پر یہ افسانہ لکھا گیا ہے جو کہ ایک ایسے رواج کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ فرسودہ خیال کیا جاتا ہے۔ تسنیم فاطمہ امروہوی لکھتی ہیں:

''اہم پیغام اس کہانی کا یہ ہے کہ لال رنگ کی کیا اہمیت ہے۔ کہانی کے آخری جملے سے ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی کہ معاشرے نے اس کو کس طرح کا نشان بنا دیا ہے۔ کہ بغیر ہوئی بات کو لے کر لوگ محض اندیشے کی بنا پر کیا کیا الٹا سیدھا سوچنے لگتے ہیں۔ مصنف نے یہاں اداسی کی تصویر کو جذبات کی گہرائی سے پیش کیا ہے۔

''صورتیں لٹکی ہوئی، آنکھوں میں آنسو۔۔۔۔۔۔وہ ٹھٹھک گیا۔

کہیں بابا کا انتقال......

یہ خیال اس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا اور اسے بری طرح لرزا گیا۔''

(''اسلم جمشید پوری بحیثیت افسانہ نگار۔ ایک جائزہ''۔ ص48)

اسلم جمشید پوری کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کے افسانے ان کے اپنے گاؤں دھنورا کی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ اسلم جمشید پوری نے ان کو اس فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ یہ ہندوستان کے ہر گاؤں کی کہانی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے اسلوب دلکش ہے زبان عام طور پر سادہ و سلیس ہے لیکن گاؤں دیہات میں بولے جاتے والے خاص الفاظ کو بے ہچک پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار، منظر نگاری اور مربوط پلاٹ کے ساتھ فضا اور ماحول کی عکاسی بھی عمدہ پیرائے میں ملتی ہے۔

''دن کے اندھیرے، رات کے اجالے'' اسلم جمشید پوری کا ایک اور قابل ذکر افسانہ ہے جس میں گاؤں دھنورا کی سیاست، ہندو مسلم بھائی چارہ، اپنوں کے درمیان کشیدگی اور اس کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے افسانے کا راوی ایک قدیم قبرستان کو بنایا ہے جو کہ اپنی ویرانی پر ماتم کناں ہے۔ قبرستان جو کبھی گاؤں کی مخلوق کے ہر طرح کام آتا تھا شادی بیاہ کے ٹینٹ لگنے سے لے کر فصلوں کو رکھنے اور جانوروں کے باندھنے تک قبرستان کا استعمال ہوتا تھا وہ اب ایک واقعے کے بعد سے ویران ہوتا چلا گیا۔ راوی کچھ اس طرح کہانی بیان کرتا ہے کہ گاؤں دھنورا جو کہ ہندو مسلم اتحاد کی مثال تھا وہاں قبرستان کی چہاردیواری کو بنانے کا خیال ''بابو جی'' کو اس لیے آیا کہ فرقہ ورانہ کشیدگی کا ماحول صوبائی سطح پر تیزی سے پنپ رہا تھا اور قبرستان پر گوجر قبضہ کر سکتے تھے۔ بہر حال جب بابو جی گاؤں کے ہندو مسلمانوں کو سمجھا کر دیوار بنانے کا کام شروع کراتے ہیں تو کچھ مسلمان ہی اس کام میں اڑچن پیدا کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ قبرستان کی زمین کو ذاتی مصرف میں لیتے رہے تھے اور اب دیوار بن جانے سے ان کے مفاد کو چوٹ پہنچ رہی تھی اس لیے الیاس اور عزیز جیسے مسلمان ہی دیوار کی تعمیر کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے:

''''یو دوال میری لاش پر بنے گی۔''

عزیز بھائی کی آواز پر پورا مجمع چونک کر انھیں دیکھنے لگا تھا۔ وہ غصہ سے آگ بولا، اپنی دھوتی کو گھٹنے سے اوپر کیے۔ دیوار کی کھدی ہوئی بنیاد میں کھڑے تھے۔ ان کے تیور اور بزرگی کو دیکھتے ہوئے ،بابو جی نے بھیڑ کو روکا، پھر پیچھے گھوم کر دیوار بنا رہے مزدوروں سے بولے۔

''بھئی کام روک لو۔ ذرا دیر سانس لے لو۔''

کام رک گیا تھا۔ سب حیرانی سے بنیاد کی نالی میں کھڑے عزیز بھائی کو دیکھ رہے تھے۔ دراصل دھنورا کے قبرستان کی چہار دیواری کا

کام چل رہا تھا۔ زمانے سے قبرستان کی اراضی یوں ہی پڑی تھی۔ ایک کونے میں قبریں بنائی جاتیں، برسوں بعد دوسرے کونے کی باری آتی۔''

(دن کے اندھیرے رات کے اجالے۔)

بہر حال بابو جی کی حکمت عملی سے دیوار تعمیر کرا دی جاتی ہے لیکن اس دیوار کی تعمیر سے گاؤں کے لوگوں میں دراڑ پڑ جاتی ہے یہ تعمیر اس کے لیے زہر کا کام کرتی ہے اور وہ اسی غم میں انتقال کر جاتا ہے کہ دیوار کی تعمیر نے اس پر ظلم کر دیا ہے۔ اسے قبرستان کی جگہ اس کے کھیت میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ یہیں سے یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ لوگ اپنے مردوں کو اپنی زمینوں میں دفن کرنے لگتے ہیں اور قبرستان ویران ہوتا چلا جاتا ہے اس طرح قبرستان اتحاد سے عداوت تک کی عبرتناک مثال بن کر رہ جاتا ہے۔ وقت گزرتا ہے جس قبرستان کو بچانے کی خاطر بابو جی اپنے مسلم بھائیوں تک سے لڑ گئے تھے اس کی ویرانی کا فائدہ اٹھا کر مرکزی حکومت یہاں پاور پلانٹ لگانے کا منصوبہ منظور کر لیتی ہے۔ اس طرح راوی اپنے قصے کو پورا کر دیتا ہے اور ایک عبرتناک انجام کے ذریعے ایک پیغام بھی چھوڑ جاتا ہے:

''اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ کوئی میرے آنسو پونچھنے والا بھی نہیں۔

جنازے میرے پاس سے گزر کر کھیتوں والے علاقے کو آباد کرتے ہیں میرے دامن کی قبریں اپنا ظاہری وجود بھی کھو چکی ہیں۔ چار دیواری کی اینٹیں لوگ حسب ضرورت اپنے گھروں میں لے جا چکے ہیں۔ میں ایک چٹیل میدان ہو گیا ہوں۔ کبھی کبھار بچے کرکٹ کھیلنے آ جاتے ہیں۔ میری شناخت ختم ہو گئی ہے۔ شاید یہ میرا آخری وقت ہے۔ ہر شے کو موت آتی ہے۔ لیکن شاید مجھے آسانی

سے موت نہیں آئے گی۔ وقت ابھی پورا نہیں ہوا ہے مجھے انتظار ہے، خاندان کے اس وسیع و عریض آنگن والے مکان میں اٹھنے والی دیواروں کی طرح اپنے قریے اور خطے میں اگنے والی دیواروں کا۔ جب مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بلند و بالا عمارتوں کی آماجگاہ بنا دیا جائے گا۔ وہ شاید میری داستان کا آخری صفحہ ہو۔

مرکزی حکومت کے منصوبے کے مطابق این سی آر میں آس پاس کے علاقے کو شامل کرتے ہی خالی پڑی زمینوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ صدیوں سے مردہ پڑی دھنورا قبرستان کی زمین، آس پاس کی زمینوں کے ساتھ ایک بڑے Power Plant کے لئے منتخب کی جا چکی تھی۔ اندھیرے دن کے اجالے میں ضم ہو کر رات کی کوکھ سے نئی روشنی کی شکل میں نمودار ہو رہے تھے۔''

(دن کے اندھیرے رات کے اجالے۔)

افسانہ ''بنتے مٹتے دائرے'' گاؤں کی کہانی ہے اور بڑے وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی ہے۔ افسانے کا آغاز اسکول میں کھیا گری راج کی بیٹی منجو اور ماتا دین مہتر کی بیٹی آشا کی لڑائی سے ہوتا ہے۔ اس لڑائی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ منجو کی غلطی کے باوجود کھیا کے خوف سے ماسٹر صاحب آشا کو ہی ڈانٹ دیتے ہیں۔ جس کی شکایت اس کی ماں ماسٹر صاحب سے کرتی ہے مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ افسانہ فلیش بیک میں چلا جاتا ہے اور آشا کی ماں شرتی گزرے زمانے کو یاد کرنے لگتی ہے جبکہ اس کے ساتھ بھی کھیا نے ظلم کیا تھا لیکن تب وہ احتجاج نہیں کر پائی تھی، آج بیٹی کے ساتھ ہوئی زیادتی کو وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔

تب وہ خواب میں خود کو کھیا بنا دیکھتا ہے اور موجودہ کھیا گری راج کو اپنا غلام۔

لیکن حقیقت میں کھیا کے آدمی اس کے خواب کو چکنا چور کر دیتے ہیں اور اس کی پٹائی کرتے

اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے

ہیں کہ وہ کام کرنے کی جگہ سو رہا تھا:

''ماتا دین نے کمر سیدھی کرنے کو خود کو زمین سے ملا دیا تھا۔ پیڑ کی چھاؤں، ہلکی ہلکی پچھوا ہوا، ویسے تو ہوا گرم تھی لیکن پیڑ کے نیچے آرام پہنچا رہی تھی، ماتا دین کو نیند آ گئی تھی۔

ماتا دین خواب کی حسین وادیوں میں تھا۔ وہ گاؤں کا کھیا تھا۔ اس کی بڑی سی بیٹھک پر مجمع لگا ہے۔ گاؤں کے امیر اور رئیس بیٹھے ہیں۔ گری راج بھی ایک کونے میں بیٹھا ہے۔ ماتا دین نے گری راج کو پکارا۔

''گری راج ــــــ وہاں کیوں بیٹھا ہے۔ ادھر آ۔''

''جی سرکار......''

گری راج کے پاس آنے پر ماتا دین نے اپنا داہنا پاؤں اس کے کندھے پر ٹکا دیا۔

''لے داب......''

اور گری راج پاؤں دابنے لگا تھا۔

''اور گری......کل سے تم گھر کا کام بھی سنبھال لو۔ میری مالش کا کام تم خود کرو گے۔ اپنے بیٹوں کو بھی لگا لینا۔''

''جی حضور......''

''اور اپنی لوگائی کو بھی مالکن کی خدمت کے لئے بھیج دینا۔''

گری راج کی گردن ہل ہل کر جی کہہ رہی تھی۔ ''

اچانک ایک زور کی آواز ہوئی۔ ماتا دین درد سے بلبلاتا ہوا جاگ پڑا تھا۔ کھیا کے آدمی ادھر آ گئے تھے اور ان میں سے ایک نے اس کے بہت زور کی لات ماری تھی۔

''کیوں بے حرام خور، کام چھوڑ کے مزے سے سو رہا ہے۔''

بے چارہ درد سے کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔''

(بنتے مٹتے دائرے)

فلیش بیک ختم ہوتا ہے تو آشا کی ماں شربتی بھگوان سے شکایت کرتی ہے۔

''ہے بھگوان تو نے ہمیں، اتنا چھوٹا کیوں بنایا۔ ہمیں بھی برہمن بنا دیتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔ دنیا ہمیں بھنگی کہتی ہے۔ زبردستی کام کرواتی ہے۔ مزدوری بھی پوری نہیں دیتے۔ اوپر سے نفرت کرتے ہیں۔ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ہے بھگوان کیا ہمارا خون اور ان کا خون الگ ہے۔ کیا ہماری کاٹھی اور ان کی کاٹھی میں فرق ہے۔ ہے بھگوان میں نے بہت سہہ لیا۔ تو نے نیچ ذات میں پیدا کیا، میں کچھ نہیں بولی۔ تو نے ماتا دین سے بیاہ دیا، جس کے گھر کوئی سکھ نہیں ملا، میں کچھ نہیں بولی۔ اپنی نظروں سے پتی کو جوتوں سے پٹتے دیکھا، میں کچھ نہیں بولی۔ لیکن آج میری بیٹی کو مارا گیا ہے۔ اب حد ہو گئی ہے اب میں بولوں گی۔''

(بنتے مٹتے دائرے۔)

آشا جوان ہو کر خود کو اتنا مضبوط بنا لیتی ہے کہ دبے کچلے لوگوں کی مدد کرتی ہے لڑکیوں کو لڑکوں کی نازیبا حرکتوں سے بچاتی ہے۔ شربتی اس کے کارناموں سے خائف ہے وہ نہیں چاہتی کہ آشا بے وجہ دشمنی مول لے اور اسے کوئی نقصان پہنچے۔ وہ اپنے پرانے دن یاد کرتی ہے کہ کس طرح شادی کے بعد پردھان کے بیٹے کا جبر اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔ گری راج نے تو سیدھے اسے اس کے شوہر سے ہی مانگ لیا تھا اپنی بیوی کی خدمت کرانے کے بہانے۔ تب شربتی میں احتجاج کا دم تھا اور نہ ہی ماتا دین میں۔

آشا گاؤں کے پنڈت لڑکے چندر موہن سے محبت کر بیٹھتی ہے۔ مکھیا ماتا دین

کو اس کے لیے سخت سست سناتا ہے عشق کے مارے آشا اور چندر موہن گاؤں سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مکھیا کے بیٹے دونوں کو گھیر لیتے ہیں اور آشا کے ساتھ زنا بالجبر کرتے ہیں ساتھ ہی چندر موہن کی بھی خوب پٹائی کرتے ہیں۔ دباؤ کی وجہ سے پولس کو مکھیا اور اس کے بیٹوں پر مقدمہ قائم کرنا پڑتا ہے اور ملزمان گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔ آشا شہر پہنچ جاتی ہے اور تعلیم حاصل کر کے گاؤں کی پردھان بن جاتی ہے دراصل اس درمیان مقدمہ لڑتے لڑتے مکھیا کمزور پڑ جاتا ہے اور گاؤں کی ایس سی/ایس ٹی کے لیے رزرویٹ پر آشا کامیاب ہو جاتی ہے۔ چندر موہن بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے گاؤں واپس آتا ہے اور آشا سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن یہاں پھر ایک بار برادری وادان کی راہ میں اڑچن پیدا کر دیتا ہے اور سیاست کی خاطر آشا چندر موہن سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔

برادری کے دباؤ میں آشا کا اپنی محبت سے دستبردار ہو جانا آج کے سماجی حالات اور برادری کی نئی سوچ کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں ذاتی مفاد اب اوپر ہو جاتے ہیں اور عشق کہیں گڈھے میں دفن ہو جاتا ہے ظاہر ہے مادیت پسند آج کی دنیا میں یہ فطری اختتام ہے جو افسانہ کو منطقی انجام تک پہنچا دیتا ہے۔

اسلم جمشید پوری کا تازہ افسانہ ''ایک ادھوری کہانی'' داستانی انداز کا افسانہ ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی کو مرکزی موضوع بنایا گیا ہے۔ دنیا میں آنے والے انسان خواہ یہ تصور کرتے ہوں کہ ان کے بغیر دنیا پھیکی ہو جائے گی۔ حقیقت یہی ہے کہ دنیا کے کاروبار یوں ہی چلتے رہتے ہیں۔ افسانہ میں دادی شادمانی بیگم اپنے پوتے پوتی اور نواسے نواسیوں کو شہزادے اور شہزادی کی کہانی سناتی ہیں۔ قصہ گو شادمانی بیگم بتاتی ہیں کہ شہزادہ جو بے حد وجیہہ مرد ہے آئی اے ایس امتحان میں کامیاب ہونے کے باوجود گھر کے حالات کی وجہ سے نوکری جوائن نہیں کرتا اور گھریلو کاروبار کو بھی فروغ دیتا ہے۔ اس کے پاس دولت اور شہرت کی کمی نہیں ہے وہ تیندوے سے بھی لڑ سکتا ہے اور بزنس کو بھی سنبھال سکتا ہے ایسے میں وہ داستانی کردار جیسا لگنے لگتا ہے۔ اس کی شہرت آس پاس کے گاؤں تک پھیلی ہوئی

ہے۔ اب دادی بچوں کو شہزادی کی کہانی سناتی ہیں جو کہ بے انتہا حسین ہے اس کی شادی شہزادے سے طے ہو جاتی ہے اور یہ شادی مثالی ثابت ہوتی ہے۔ بارات کے آنے جانے اور تمام رسوم کی ادائیگی کو اسلم جمشید پوری نے اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ لگتا ہے پردے پر فلم دیکھ رہے ہوں۔ جزئیات پر خاصا زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ بارات کے کھانے اور رسومات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ شادی بہت کامیاب رہتی ہے افسانے میں نیا موڑ تب آتا ہے جبکہ اچانک شہزادے کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے اور اس کا بیان اس قدر سوزناک ہے کہ دادی کہانی سناتے سناتے خود بے حد غمگین ہو جاتی ہیں اور بچے بھی رو اٹھتے ہیں۔ دادی کی حالت اچانک بگڑتی ہے اور وہ انتقال کر جاتی ہیں۔ تب قصہ کو تبدیل ہو جاتا ہے۔ لمبا وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا اور شادمانی بیگم کی پوتی سمیہ جو کہ اب خود دادی بن چکی ہے ادھوری کہانی کو پورا کرتی ہے اس طرح کہانی سنانے کا یہ سلسلہ سمیہ نے شروع کر دیا ہے۔ افسانہ داستانی طرز کا ہے اور اس میں عصری حالات کو بھی جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے مثلاً مظفر نگر فسادات اور کانوڑ نکلنے اور رمضان کے ساتھ پڑنے کی وجہ سے فسادات ہونے کا خوف وغیرہ۔ افسانہ میں جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ پہلے سے جاری ہے اور بعد میں بھی جاری رہتی ہے۔ اس طرح اسلم جمشید پوری نے قدیم و جدید دور کے درمیان کی کڑی کو مرکزی موضوع کی حیثیت سے برتا ہے۔ اختتام بھی بے حد فطری ہے:

’’یہی کہانی ہے یہ بچو! شادمانی بیگم کو ہم نے دیکھا تھا۔ ہم نے ان کے منہ سے کہانیاں سنی تھیں۔ لیکن ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ہماری دادی شادمانی بیگم ہی دراصل شہزادی تھیں۔ وہ اپنی اصل کہانی سنا رہی تھیں اور ہم شہزادے، شہزادی کی کہانی میں گم تھے۔‘‘

سمیہ تھوڑی دیر کو رکی تو اس کے نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیاں ایک ساتھ بول پڑے۔

’’پھر کیا ہوا۔۔۔؟‘‘

’’پھر یہ ہوا کہ شہزادے کے انتقال کا واقعہ سناتے سناتے شہزادی بھی اپنے شہزادے کے پاس چلی گئی۔۔۔‘‘

’’بچو چلو۔ سو جاؤ۔ آج کہانی یہیں ختم، باقی کہانی کل پوری کروں گی‘‘

(ایک ادھوری کہانی)

اسلم جمشید پوری کے افسانے موضوعات، تکنیک، وحدت تاثر، اسلوب اور فکر و فن کے لحاظ سے انفرادی اہمیت کے حامل ہیں اور یہ افسانے پریم چند کی روایت کے سچے امین ہیں۔ اسلم جمشید پوری نے اپنی کہانیوں کے لیے افسانوں کا خمیر برصغیر کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی سے اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے وسیع مطالعہ و مشاہدہ کے ذریعے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھانے کی سعی کی ہے۔ ان افسانوں میں طبقاتی اور معاشرتی وغیرہ تضادات کے افسانے پر قاری چونک اٹھتا ہے۔ معاشی، معاشرتی اور طبقاتی تضادات سے لے کر اشخاص کی نفسیات، رویوں، رجحانات، جذبوں اور احساسات کا ان کے افسانوں میں بے لاگ تبصرہ و تذکرہ موجود ہے۔ اسلم جمشید پوری کے افسانے ان سے پہلے کے افسانہ نگاروں اور نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے درمیان ربط پیدا کرنے کا انفرادی ذریعہ ہیں۔ وہ پرانے افسانہ نگاروں کے ذہنی اور تخلیقی رویوں کے ارتقاء میں تعاون کرتے ہیں اور نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔

☆☆

شبراتی

بیلوں کو آنگن میں نیم کے نیچے باندھ کر اس نے ہل اسارے کے نیچے کھڑا کر دیا۔ سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے کمر کو سیدھا کیا۔ ہاتھ میں پانی کا خالی گھڑا لیے وہ اندر پہنچا۔ شبراتن کو دیکھ کر بولا۔

''اری شبراتن آج کچھ جادہ ہی تھک گیا ہوں۔ جوڑ جوڑ دکھ رو (رہا) ہے اوپر والو (والا) کھیت دو بار جوتو (جوتا) ہے۔ جرا (ذرا) ایک گلاس گرم گرم دودھ پلا اور ہاں دودھ میں میٹھا مت ڈالیو۔ بس گڑ کا ایک ٹکڑا لائیو۔''

شبراتن نے دودھ کا گلاس بھرا، گڑ کے بھیلا سے تھوڑا گڑ پھوڑ کر شبراتی کے پاس آئی۔ ایک ہاتھ میں دودھ بھرا گلاس اور ایک میں گڑ دیتے ہوئے وہ شبراتی سے بولی۔

''سنتے ہو نائی آیو تھو (آیا تھا) بلاوو دے گو ہے (بلاوا دے گیا ہے)۔ چار بجے سانجھ کو اسکول میں پنچایت ہے۔ تمہیں بھیجنے کو کہہ گیو (گیا) ہے اور ہاں تم نے سنو (سنا) کلوا کی نئی بھینس مرگئی ہے۔''

شبراتی ایک گھونٹ دودھ کا بھرتا اور پھر تھوڑا سا گڑ کاٹ کر کھاتا۔ پورا دودھ پینے کے بعد اس نے کہا۔

''ہاں شبراتن۔ بے چارے کلوا کی بھینس مرگئی۔ موئے بڑو (بڑا) دکھ ہے۔ اس

گریب نے ابھی بچے کی پینٹھ سے تولی تھی''

زور سے ڈکارتے ہوئے وہ اٹھا اور نل کے پاس جا کر ہاتھ پاؤں دھوئے۔ باہر بیٹھک میں رکھے حقے کی چلم اٹھائی۔ اس کی راکھ کو کوڑے پر گرایا۔ نئے تمباکو کا ایک گولا بنایا اور اسے چلم کے ٹھیک بیچوں بیچ سجاتے ہوئے رکھا اور اس کے اوپر ایک ٹوٹا ہوا کھنا (کھپریل کا ٹکڑا) رکھا اور آگ لینے کے لیے گھر گیا۔

''شبراتن، آگ ہے گی۔؟''

''ہاں دیکھے تو ہے۔ پر تھوڑی سی ہوئے گی۔ لاؤ میں رکھ دوں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ بیٹھک کے باہر نیم کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر حقہ کی نے منھ میں دبائے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ موسم گرم تھا۔ لیکن باہر نیم کے نیچے اسے کچھ راحت ملی۔ حقہ پیتے پیتے وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

****

گاؤں کے اسکول میں لوگ جمع تھے۔ جمن کاکا، شری کرچاچا، کنور پال، مہابیر، مہندر ٹھاکر، پنڈت گوپال، شبراتی، مکھیا ملکھان سنگھ اور بہت سے لوگ۔ روز بروز کی بڑھتی ہوئی جانوروں کی بیماریوں سے تنگ آ کر گاؤں کے مکھیا ملکھان، پنڈت گوپال اور مہندر ٹھاکر جیسے بڑے لوگوں نے ایک ہنگامی پنچایت بلوائی تھی۔

مکھیا ملکھان سنگھ نے کھڑے ہو کر کہا۔

''بھائیو۔ آپ کو تو پتوی (پتہ) ہے کہ آج گاؤں کے جانوروں میں بیماری گھسی ہوئی ہے۔ جانور مرتے جا رہے ہیں، ہمیں اس سمسیا کو (کا) سمادھان کرتو (کرنا) ہے۔''

''ہاں ملکھان چاچا ای بہت جروری ہے۔ کل بے چارے کلوا کی نئی بھینس مرگئی۔''

ملکھان سنگھ کی بات کے بیچ ہی مہابیر بول پڑا۔

''ہاں.... مکھیا جی.... ہماری گائیں بھینس تو بالکل سوکھ گئی ہیں۔ دودھ جیسے تھنوں

میں سوکھ گیو (گیا) ہے۔ کچھ اپائے کرو کھیا جی" کنور پال کی بات سب نے سنی۔

"ہاں، ہاں.... کچھ ہو تو (ہونا) چیے (چاہیے)"

بہت سی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ پنڈت گوپال نے حقے کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"گاؤں میں دکھ گھس گیا ہے۔ ہمیں ہر سمھو یا سو (اس سے) چھٹکا رو چیے (چھٹکارا چاہیے)"

جمن کا کا جو بڑے دھیان سے سن رہے تھے بولے۔

"ہاں! پنڈت جی، ہمیں دکھ نکلوا تو (نکلوانا) ہے۔ آپ کوئی بڑھیو سو (اچھا سا) دن رکھ دیں"

پنڈت گوپال نے اپنی پوتھی کھولی۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پنڈت جی کی آواز بلند ہوئی۔

"پردھان جی۔ آج بدھوار ہے۔ ایسا کرتے ہیں روی وار کور کھتے ہیں۔ روی وار کی رات شبھ رہے گی۔"

ہاں.......ہاں.... ٹھیک ہے۔"

ایک ساتھ کئی آوازوں کا شور بلند ہوا۔ کھیا جی اور ٹھاکر مہندر نے کچھ مشورہ کیا اور پھر کھیا جی کی آواز گونجی۔ خاموشی پھر چھا گئی۔

"بھائیو! روی وار کی رات دکھ نکلوایا جائے گا۔ آپ سب تیار رہیو اور ہاں اس بار آگ کا کروا (مٹی کا گھڑا نما برتن) شبراتی سنبھالے گو (گا) کیا شبراتی یا کو (اس کے لیے) تیار ہے؟"

کھیا جی کے سوال پر پوری پنچایت میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر ایسا محسوس ہوتا رہا گویا کسی جادوگر نے گاؤں کے سبھی لوگوں کو مٹی کا بنا دیا ہو۔ ایک کونے میں بیٹھے شبراتی نے بیڑی کا ایک لمبا کش لیا اور بیڑی کو زمین پر رگڑ کر بجھایا، بچی ہوئی بیڑی کو

کان کے اوپر لگاتے ہوئے کھڑا ہوا اور انکساری سے بولا۔

"کھیا جی۔ یو میرو (یہ میرا) سو بھاگیہ ہے جو موئے یا (مجھے اس) کام کو (کے لیے) چنو گیو (چنا گیا)۔ اللہ نے چاہو تو میں اچھی طرح اپنو کام نبھاؤں گو (گا)۔" اتنا کہہ کر شبراتی خاموش ہو گیا۔ کھیا جی نے ایک بار پھر بہ آواز بلند پورا پروگرام سنایا اور پھر پنچایت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

•••••••

دھنورا، اتر پردیش کے ضلع بلند شہر کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں کسانوں اور مزدوروں کی آبادی رہا کرتی تھی۔ گاؤں میں مختلف مذاہب اور برادریوں کے لوگ صدیوں سے ساتھ ساتھ رہتے آ رہے تھے۔ گاؤں کا انحصار کھیتی پر تھا اور کھیتی کے لیے کسانوں کی امیدیں صرف آسمان کے بادلوں سے تھیں، جس سال بارش نہ ہوتی، کھانے کے لالے پڑ جاتے۔ سینچائی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ ادھر چند برسوں میں چھ سات ٹیوب ویل لگ گئے تھے۔ جن میں دو سرکاری تھے۔ سرکاری کیا تھے کھیا ملکھان سنگھ، ٹھاکر مہندر اور پنڈت گوپال ہی اس کے کرتا دھرتا تھے۔ کسی کو پانی لینا ہوتا تو ہفتوں ان کے تیل لگاتا۔ بارش کے بغیر جانوروں کے چارے کی بھی قلت ہو جاتی اور کیوں نہ ہو۔ جب انسانوں کو کھانے کے لیے نہیں تو جانوروں کی تو بات ہی کیا۔ برسوں قبل قحط پڑا تھا جس میں سینکڑوں لوگ بھوک موت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ نئی نئی بیماریاں خود ساختہ لیڈروں کی مانند ابل پڑی تھیں۔ جانوروں میں ایک خاص قسم کی بیماری نے گھر کر لیا تھا۔ دودھ تھنوں میں سوکھ گیا تھا اور جانوروں کی شرح اموات بڑھ گئی تھی۔ گاؤں والوں نے اس بیماری کا نام دکھ رکھا تھا۔

شبراتی نے دھنورا ہی میں آنکھ کھولی تھی۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تھا تو صرف اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ اس کے والد ایک بیماری میں لقمہ اجل بن گئے تھے اور اپنے پیچھے دکھوں اور غموں کے بے شمار لقمے چھوڑ گئے تھے۔ انہیں لقموں کو تہہ در تہہ اپنے پیٹ میں اتار کر شبراتی بڑا ہوا تھا۔ لوگوں کی زبانی اس نے سنا تھا کہ اس کے بابا نیک اور شریف آدمی تھے، کبھی کسی

سے لڑائی نہ جھگڑا۔ بس اپنے کام سے کام۔ دن بھر باہر تھیے پر بیٹھے کام کرتے رہتے۔ کبھی کسی کا ہل بنا رہے ہیں تو کبھی کسی کی چوکھٹ..... زمین تو تھی نہیں بس کسانوں کے رحم و کرم پر گزر بسر ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی من بھر گیہوں دے جاتا۔ کبھی کسی کے یہاں سے گڑ آ جاتا۔ کوئی اپنے کھیت سے چارا کاٹنے کو کہہ دیتا۔

وہ اپنے والد کو یاد کر کے غم زدہ ہو جایا کرتا۔ اس نے بڑے ہو کر اپنے والد کا ہی پیشہ اختیار کر لیا۔ والد کے چھوڑے ہوئے اوزار تھے اور بندھے ہوئے کسان۔ بچپن گزرا، جوانی آئی، شادی ہوئی کہ اچانک ایک دن ماں کا انتقال ہو گیا۔ پھر کے بعد دیگرے دو بچے آ گئے۔ اکثر اسے اللہ کے نظام پر رشک آتا کہ اس نے اس کی زندگی کو دکھ اور سکھ کے ترازو میں بڑا متوازن رکھا تھا بلکہ دکھوں کا پلڑا ہی اکثر جھکا رہا۔ وہ بڑی مشکل سے زندگی کی گاڑی کو محنت کے بیلوں کے سہارے کھینچ رہا تھا۔ گاؤں کے فیصلے کے آگے اس نے اپنا سر خم کر دیا تھا۔ جب کہ اس کی بیوی نے دبے لفظوں، اس کی مخالفت بھی کی تھی۔

....

رات تاریک تھی۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ آسمان کالے کالے بادلوں سے بھرا تھا۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج ماحول کو پر ہول بنا رہی تھی۔ ملکھان سنگھ کی بیٹھک پر گہما گہمی تھی۔ گاؤں کے نوجوان اور بوڑھے جمع تھے۔ شبراتی نے سر پر منڈاسہ (پگڑی) اور دھوتی کو لنگوٹ کی صورت پہن رکھا تھا۔ اس کے پورے جسم پر کالی سیاہی ملی ہوئی تھی۔ چہرہ بھی کالک سے پوت دیا گیا تھا۔ دس بجے کئے نوجوان بھی کچھ اسی قسم کا حلیہ بنائے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں لاٹھی اور بلم تھے۔ تیاری مکمل تھی۔ بس مکھیا کی اجازت دینے کی دیر تھی۔ تھوڑی دیر بعد مکھیا کی آواز گونجی۔

"ہے بھگوان ہم تیرو نام لے کر اپنے گاؤں میں تھے دکھ کو نکال رہے ہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ شبراتی اور اس کے گروہ سے مخاطب ہوئے۔

"بھگوان کا نام لے کر آپ لوگ شروع کرو۔"

اتنا سننا تھا کہ شبراتی، جس کو بالکل کالا بھوت بنا دیا گیا تھا۔ ہاتھ میں کروا لیے، جس میں دہکتی ہوئی آگ تھی، آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے اس گروہ کے دس نوجوان تھے سبھی "ہو۔ ہا..... شو....." کی عجیب و غریب آوازیں نکالتے جا رہے تھے۔ پورا ماحول ایک عجیب سے شور سے گونجنے لگا۔ قافلہ گاؤں کی ایک ایک گلی سے گزرنے لگا۔ گاؤں والوں نے رات ہی کو اپنے اپنے دروازوں پر ایک ایک خالی گھڑا رکھ دیا تھا۔ شبراتی کے پیچھے چلنے والے نوجوان، جس گھر کے سامنے سے گزرتے وہاں رکھے گھڑے کو لاٹھی مار کر پھوڑتے جاتے۔ شبراتی گھر گھر جا کر جانوروں کے پاس سے آگ کے کروے کو گھماتا ہوا اپنا کام بڑی ہی تندہی سے کر رہا تھا۔ ایک طرف "ہو...... ہا...... شو" اور گھڑوں کے پھوٹنے کی آوازیں تھیں تو دوسری طرف گاؤں کے بے شمار لوگ جا بجا جامد و ساکت کھڑے دکھ نکالتے ہوئے قافلے کو دیکھ رہے تھے۔ شبراتی کی بیوی بھی اپنے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ جب شبراتی وہاں سے گزرا تو وہ ایک لمحے کو اپنے شوہر کو عجیب بھیس میں دیکھ کر ڈر ہی گئی تھی۔ شبراتن دل ہی دل میں شبراتی کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

"اے اللہ میرے پتی کو سپھل واپس لائیو۔"

گاؤں کی ایک ایک گلی سے دکھ نکالتا ہوا یہ قافلہ رواں دواں تھا۔ آگے آگے شبراتی اور پیچھے ساتھی نوجوان۔ شبراتی تیز تیز قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کے ساتھی اس سے دس بارہ قدم پیچھے تھے۔ اب وہ لوگ گاؤں کی آبادی سے باہر نکل آئے تھے۔ اچانک بڑے زور سے بادل گرجے اور پورا آسمان روشنی میں نہا گیا۔ گویا گاؤں والوں کے عقیدے پر آسمان زور سے ہنسا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش ہونے لگی۔ شبراتی ہاتھ میں آگ کا برتن لیے تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ بارش نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس قدر تیز بارش تھی کہ لگتا تھا گاؤں کو بہا لے جائے گی۔ تھوڑی ہی دیر میں چاروں طرف پانی بھرنے لگا۔ شبراتی بارش اور طوفان کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ اس کے برتن کی آگ کچھ دیر تو بارش کے پانی سے جد و جہد کرتی رہی پھر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ طوفان کا زور بڑھتا

جا رہا تھا۔ کھیتوں میں پانی دکھائی دینے لگا۔ کچھ دیر تک شبراتی کو اپنے پیچھے پانی میں چھپ چھپ کی آوازیں آتی رہیں۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ چاروں طرف سوائے اندھیرے کے کچھ نہ تھا۔ اب اس کے ساتھیوں کے چلنے کی آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ شبراتی نے سوچا وہ کچھ فاصلے پر خاموش آ رہے ہوں گے۔ طوفان کی شدت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ ایک بار اس کے دل میں آیا کہ واپس گاؤں لوٹ جائے مگر واپس جا کر گاؤں والوں سے کیا کہے گا؟ منزل تھوڑی ہی دور تو تھی اور وہ پھر پوری قوت سے آگے بڑھنے لگا۔ مٹی کے برتن کو مضبوطی سے پکڑے وہ اندازے سے آگے بڑھتا رہا۔ چاروں طرف سیاہی ہی سیاہی تھی۔ کھیتوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا تھا۔ راستے کے تمام نام ونشان ڈوب چکے تھے۔ شبراتی کو گاؤں کی سرحد پار مٹی کے کروے کو زمین میں گاڑ کر واپس لوٹنا تھا۔

بارش زوروں پر تھی۔ سرد ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ سردی کے مارے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹھنڈ کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں پھیل گئی تھی۔ اس نے اپنے اوسان جمع کیے اور گاؤں کی سرحد کی طرف بڑھنے لگا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا گویا یہی پنڈت گوپال کا کھیت ہے۔ گوپال کے کھیت کے پار دوسرے گاؤں کے کھیت تھے۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے گوپال کے کھیت میں داخل ہو گیا۔ کھیت کے پار سرکاری ٹیوب ویل کی گہری پختہ نالی تھی جو جا بجا ٹوٹی ہوئی تھی۔ کئی جگہ خطرناک حد تک گہری ہو چکی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے نالی کو پار کیا۔ اب وہ دوسرے گاؤں کی سرحد میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ ایک لمحہ کو رکا اور بلند آواز میں چیخا۔

"جا دکھ جا..... ہمارے گاؤں سو جا۔"

تین بار زور سے کہنے کے بعد اس نے اپنے قدموں کے پاس پانی کے اندر مٹی ہٹا کر گڈھا بنایا اور مٹی کے کروے کو اس میں داب دیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور واپس ہو لیا۔ طوفان کا زور تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آسمان پر کالی چادر نظر آ رہی تھی اور زمین پر دور تک پانی ہی پانی۔

درخت بڑے بڑے بھوت اور جن کی مانند لگ رہے تھے گویا اس کی واپسی کے منتظر ہوں۔

****

شبراتن کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ اس نے تقریباً ۱۱ بجے اپنے شوہر کو وداع کیا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار خدا سے اپنے شوہر کی کامیابی کی دعائیں کر رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ رات تین بجے تک شبراتی واپس نہیں آیا تو اس کا انتظار پریشانی میں بدل گیا۔ کبھی دروازے تک آتی اور کبھی بچوں کے پاس لیٹتی۔ نہ جانے کس پہر اس کی نیند سے بوجھل آنکھوں میں سکون کے بادل چھا گئے اور وہ نیند کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔

****

صبح آسمان بالکل صاف تھا۔ گاؤں کے تمام راستے پانی سے لبریز تھے جو رات کے طوفان کے چشم دید گواہ تھے۔ مکھیا ملکھان سنگھ کی بیٹھک پر مجمع لگا تھا۔ کئی بڑے بڑے ڈرام رکھے تھے۔ جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پنڈت گوپال اشلوک پڑھتے جا رہے تھے اور ڈراموں میں گنگا جل ملا رہے تھے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں سے تھوڑا دودھ لے کر آتے، ڈرام میں ڈالتے اور ملا کر لے جاتے۔ پنڈت گوپال لوگوں سے کہہ رہے تھے۔

"اپنے اپنے جانوروں پر یا دودھ کی چھینٹیں مارو۔ اب کوئی چنتا نہ کریں۔ دکھ نکل گو (گیا ہے) اب ساری بیماریاں ختم ہو جائیں گی۔"

جمن کاکا، کنور پال، مہندر ٹھاکر، شری گر چاچا اور دوسرے گاؤں کے بڑے لوگ وہاں موجود تھے۔ اتنے میں شبراتن روتی ہوئی آئی۔

"مکھیا جی...... میرو پتی ابھی تک گھر نہیں آیو......"

وہ زور سے روئے جا رہی تھی۔ اس کی آواز پر بیٹھک پر موجود سبھی کے کان کھڑے ہو گئے۔ مکھیا کی آواز گونجی۔

"ارے کنور پال تمہارو لڑکا بھی تو شبراتی کے ساتھ تھو۔ کیا وہ واپس آ گو؟"

"ہاں وے سب تو رات ایک بجے ہی واپس آ گئے ہے۔"

"ہائے میرو پتی....."

کنور پال کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی شبراتن دہاڑیں مارنے لگی۔ سبھی کے چہرے مرجھا گئے تھے۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ رات شبراتی واپس نہیں آیا۔

مکھیا جی کی رہنمائی میں سارا گاؤں پنڈت گوپال کے کھیت کی طرف چل پڑا۔ چاروں طرف پانی کی حکومت تھی۔ گوپال کا کھیت بھی پانی سے لبالب تھا۔ شبراتی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اچانک کسی کے زور سے چلانے کی آواز آئی۔

"شب......شبراتی......!!"

سب اس طرف لپکے۔ جس کا سرکاری نالی پر کھڑے تھے۔ وہاں شبراتی کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس کا جسم پھول کر کافی موٹا ہو چکا تھا۔ جا بجا کا لک لگا اس کا جسم بہت ہی ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ نالی کے گہرے پانی سے بڑی مشکل سے اس کی لاش کو نکالا گیا۔ لوگوں کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔

"ہائے اللہ......"

ایک دلدوز و دلخراش چیخ کے ساتھ شبراتن شبراتی کے بے جان جسم سے لپٹ گئی۔ اس کے دونوں بچے بھی روتے ہوئے لاش پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

گاؤں والوں کی زبانوں پر تالے پڑ گئے تھے۔ ان کے سروں پر مانو منوں بوجھ تھا کہ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل گاؤں میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ گاؤں سے دکھ نکل گیا تھا۔

شبراتی کے دونوں بچے اپنی ماں کا دامن کھینچ رہے تھے گویا کہہ رہے ہوں، ماں ہمارے گھر میں گھسے دکھ کو کون نکالے گا......؟

☆☆

لینڈرا

"ارے او فقیرے....جرا نکّے کو (ذرا ادھر) آتا۔"

بابا رحیم کی آواز پر فقیر محمد، دوڑتا ہوا آیا۔

"جی بابا۔ کا کہے ریو (کیا کہہ رہے ہو؟)"

"ارے جرا حقہ بھر لا — اور تا جا بھی کر لائیو —"

بابا کے کہنے پر اس نے حقے کی پیتل کی فرشی کو اس کی گردن سے پکڑ کر اٹھایا۔ بڑی احتیاط سے چلم کو نیچے سے اتارا۔ نیچے کو فرشی کی گردن سے الگ کیا۔ نیچے کی بناوٹ بالکل بندوق جیسی تھی۔ فقیر محمد کے دل میں لمحے بھر کو ایک خیال آیا۔ اس نے حقے کے نیچے کو بندوق کی طرح پکڑ لیا اور تصور میں اپنے سبھی دشمنوں کو ٹھائیں ٹھائیں....کر دیا۔ اس کو گاؤں کے ہر اس شخص سے نفرت تھی جو اسے لینڈرا کہتا تھا۔ کتنی نفرت اور حقارت ہوتی تھی ان کے لہجے میں۔ اسے وہ دن بھی یاد تھا جب وہ پہلی بار گاؤں صدر پور میں اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا۔

فقیر محمد، اپنی ماں کے ساتھ سلیم پور گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کی عمر ۵ رسال تھی۔ اس کے والد ٹی بی کے مریض تھے۔ انھیں خون کی الٹیاں ہوتی تھیں۔ ایک دن بیماری نے انھیں شکست دے دی۔ لوگوں نے والد صاحب کو خاک کے سپرد کر دیا۔ وہ اور اس کی ماں

روتے رہ گئے۔ وہ دونوں بھری دوپہری میں بے سایہ ہو کر رہ گئے تھے۔ غریبی کا زمانہ تھا۔ لوگوں کے پاس کھانے کو وافر مقدار میں اناج نہیں ہوتا تھا۔ گیہوں کی روٹی کم لوگوں کو نصیب ہوتی تھی۔ گیہوں کا آٹا مہمانوں کے لیے رکھا جاتا تھا۔ باقی دنوں گھر کے لوگ جو، بے جھڑ، مٹر اور باجرے کی روٹیاں کھاتے تھے...... فقیر محمد کو گیہوں کی روٹی ہی اچھی لگتی تھی۔ اسے جو اور باجرے کی روٹی بالکل پسند نہیں تھی۔ جب بھی مہمان آتے، تو وہ انتظار میں بھوکا رہتا۔ کاش مہمانوں کے آگے سے روٹی کا کوئی ٹکڑا بچ جائے۔ بچا ہوا ٹکڑا اماں اسے ہی دیا کرتی تھی۔ بعد میں وہ، مجبوری میں جو کی روٹی سے پیٹ بھرتا تھا۔

فقیر محمد کے والد کے انتقال کے بعد عدت پوری ہوتے ہی اس کے ماماان دونوں کو اپنے گاؤں میپے لے آئے تھے۔ نانا کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ بوڑھی نانی — اور دو ماموں — مائیں اور ان کے بچے — سب نے ان کے غم میں برابر کا شریک ہوتے ہوئے ان سے ہمدردی جتائی تھی۔ بڑے ماموں افسردہ لہجے میں بولے۔

"اب جیسی اوپر والے کی مرجی — ایک دن تو سب کو جانو (سب کو جانا) ہے۔"

نانی کی آواز بمشکل گلے سے نکل رہی تھی۔

"بٹیا ہمار کو تو بھاگیہ ہی پھوٹ گیو (ہمارا تو بھاگیہ ہی پھوٹ گیا)۔"

مائیں نے فقیر محمد کو گود میں اٹھالیا اور پیار کرنے لگی تھیں۔

نانی اور امی، مائیں اور امی، باری باری گلے مل کر روئیں تھیں۔ کچھ دیر بعد حالات معمول پر آنے لگے تھے۔ ہر شخص فقیر محمد اور اس کی ماں کا خیال رکھتا۔

وقت پرواز کرتا رہا۔ فقیر محمد اب ۱۰ برس کا ہو گیا تھا۔ وہ ماموں کے ساتھ کھیت کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتا۔ اس کی امی گھر کے کام کاج میں جٹی رہتیں۔ ان سب کے باوجود گھر کے ماحول میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ نانی کے علاوہ گھر کے سبھی افراد ان دونوں سے اندر اندر کڑھنے لگے تھے۔ کئی بار فقیر محمد نے خود اپنی مائیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا:

"ہماری چھاتی پر آ پڑی ہے۔"

"پتہ نہ کب ٹلن گے (ٹلیں گے) یہاں سو۔"

حد تو اس وقت ہو گئی جب ماموں کے رویے میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ ان کے بچے بھی اب فقیر محمد کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ بلکہ اس کی توہین اور بے عزتی کرنے کا موقعہ تلاش کرتے رہتے۔ ایک بار فقیر محمد اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ساتھ میں ان کے دوست بھی تھے۔ بال کسی پڑوسی کے گھر چلی گئی تھی۔ ماموں زاد نے بڑی حقارت اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

"او فقیر — جا بال لی آ —"

فقیر محمد کو بہت برا لگا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ماموں زاد بدتمیزی پر اتر آیا۔

"اب او۔ جاوے کہ نا... سالے بہت مارن گو (ماروں گا) —"

اور اسے اس کے دوستوں نے بھی گھیر لیا تھا۔ وہ قہراً جبراً بال کے لیے چلا گیا تھا۔

فقیر محمد کو اس وقت بہت غصہ آتا جب کوئی اس کی ماں کو برا بھلا کہتا۔ جی میں آتا کہ کہنے والے کا منہ نوچ لے۔ لیکن بے بس ہو کر رہ جاتا۔ ابھی اس کی عمر کم تھی دوسرے وہ ان کے رحم و کرم پہ ہی تو تھے۔ دراصل انسان کی پہچان، برے وقت میں ہی ہوتی ہے۔ برا وقت جب کسی پر آتا ہے تو رشتہ دار اور احباب کچھ ہی دن اس سے ہمدردی جتاتے ہیں۔ پھر ایک ایک کر کے اچھے دنوں کی مانند رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک تو عام بات ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمدردی جتانے والے اقربا اور احباب شدید نفرت کرنے لگتے ہیں۔ مخالف ہو جاتے ہیں۔ نقصان پہنچانے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں۔ ماں بیٹے پر ایسا ہی وقت آ گیا تھا — فقیر محمد سب سمجھنے لگا تھا۔ اب وہ دونوں ننھیال میں بوجھ بن گئے تھے۔ پر وہ کرتا بھی تو کیا۔ ابھی تو اس کی عمر ہی کم تھی۔ دل مسوس کر رہ جاتا۔ بس اللہ سے دل ہی دل میں دعا کرتا۔

"اے اللہ، ہمارے اوپر رحم کریو —"

****

گاؤں صدر پور میں رحمت اور رمضان دو بھائی رہتے تھے۔ دونوں کے پاس گزارے لائق زمین تھی۔ رحمت کی بیوی کو کینسر ہو گیا تھا۔ غریبی اور کینسر جیسی بیماری — غریب تو بیماری کا نام سن کر ہی مرلیتا ہے۔ یہی ہوا، رحمت کی بیوی علاج کے فقدان میں وقت سے قبل ہی موت کی آغوش میں سماگئی۔ رحمت کے پاؤں میں لنگ تھا۔ انھیں زیادہ تر لوگ رحمت لنگڑے، لنگڑا اور لنگڑے بابا کہہ کر پکارتے تھے۔ رحمت کی عمر بھی کوئی ۴ کم چالیس رہی ہوگی۔ لیکن غربت نے انھیں، جلد ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ ان کی لنگڑاہٹ کا بھی ایک قصہ تھا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ گاؤں میں ایکھ (گنے کا کھیت) شباب پر تھی۔ کولہو لگ چکے تھے۔ کولہوؤں پر رات دن کام ہوتا تھا۔ رات کو کولہو کے کڑھاؤ کے پاس لوگوں کی بھیڑ ہوتی۔ کچھ تو سردی دور کرنے اور کچھ گڑ کی خوشبو لینے آجاتے۔ گڑ کے بھیلے بنائے جارہے ہوتے۔ کولہو کے آس پاس زندگی ہی زندگی نظر آتی۔

کولہو پر اب رحمت اور رمضان کی ایکھ کی باری تھی۔ دونوں بھائیوں نے گانڈے (گنے) ڈھو کر پہلے ہی کولہو کے پاس ڈھیر لگا دیا تھا۔ رحمت نے کولہو میں گانڈے لگانے کا کام لے لیا اور رمضان بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ رحمت تین۔ تین، چار۔ چار گانڈے ایک ساتھ لگاتا۔ گانڈے لگانے پر کولہو کے بیلن ٹائٹ ہو جاتے۔ بیلوں پر بھی زور پڑتا لیکن اگلے لمحے ہی رس دھار کی شکل میں نکلتا۔ لکڑی کے پتنالے سے ہوتا ہوا گول (گھڑے نما برتن) میں جا گرتا۔ جو کہ گڈھے میں رکھی ہوتی۔ دوسری طرف گانڈے کی کھوئی نکل کر گرتی۔ کھوئی جمع ہوتے ہوتے ایک چھوٹا سا پہاڑ بن جاتا۔ رحمت بار بار اُسے کولہو سے دور کرتا رہتا۔ رحمت کولہو میں گانڈے پیلتا اکثر سوچتا۔ انسان کی زندگی بھی کولہو کی طرح ہے، جسے گانڈے کی شکل میں ہر وقت خوراک چاہیے ورنہ، رس کہاں سے نکلے گا، اور رس نہیں نکلے گا تو گڑ کہاں سے آئے گا۔ چینی کیسے بنے گی۔ یعنی زندگی میں مٹھاس کہاں سے آئے گی؟ ہم سب زندگی میں کبھی کولہو کے بیل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کولہو میں گانڈے پیلتے ہیں۔ کبھی بیلوں کو ہانکتے ہیں۔ کبھی کڑھاؤ کے نیچے بنے جھوک میں آگ سلگاتے ہیں اور کبھی

رس کو کھولاتے ہیں۔ طرح طرح کے پاؤڈر ڈال کر اسے صاف کرتے ہیں اور روادار بناتے ہیں۔ یہ سب کام ایک شخص کا نہیں ہے۔ کولہو مشترکہ نظام زندگی ہے۔ لوگوں کا ایک پلیٹ فارم ہے۔ اکیلا آدمی سارے کام خود نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اکیلا آدمی زندگی کی دوڑ میں بھی کبھی کبھی ناکام رہ جاتا ہے—

"ابے رحمت ادوسری طرف سے کھوئی ہٹا— کہاں کھویو (کھویا) ہے؟"

رمضان کی آواز پر رحمت چونکا۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے ہی اپنی ایک ٹانگ کھوئی کے چھوٹے سے پہاڑ پر ماری۔ اس سے قبل کے وہ اپنی ٹانگ کو کھینچ پاتا۔ اس کا توازن بگڑ گیا اور اس کی ٹانگ کولہو کے بیلن میں آگئی۔

"کڑاک۔"

ٹانگ کا نچلا حصہ ہڈیوں سمیت پس گیا۔ اور ایک فلک شگاف، جگر خراش چیخ بلند ہوئی۔

رمضان بیلوں کو چھوڑ، رحمت کی طرف لپکا۔ آس پاس کے لوگ گرتے پڑتے، دوڑے، رحمت کا خون گانڈے کے رس میں تحلیل ہو کر گول میں جا پہنچا تھا۔ اور اس نے رس کی رنگت تبدیل کر دی تھی۔ سرمئی رنگ بھی خون میں مل کر گہرا لال ہو چکا تھا بلکہ کچھ کچھ کتھئی— ایسا لگ رہا تھا گویا کسی جاگیردار نے گاؤں کے کسانوں اور مزدوروں کو کولہو میں پیل کے ان کا رس نکال دیا ہو۔

رحمت کو فوراً بگھی میں ڈال کر شہر لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر نے اس کی ٹانگ کا آپریشن کیا۔ زہر پھیلنے سے بچانے کے لیے رحمت کی ٹانگ کو گھٹنے کے نیچے سے کاٹا گیا۔ غریبی کا زمانہ تھا آپریشن اور علاج معالجے میں ہزاروں روپے کا صرفہ آیا، رحمت کے بابا نے دو بیگھہ زمین پر رحمت کو فوقیت دی۔

رحمت ایک مہینے سے زیادہ اسپتال میں رہا۔ اسپتال سے آنے کے بعد کچھ دن لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ رہیں۔ لوگ اس سے اسپتال کا حال پوچھتے۔ حادثے

کے بارے میں جاننا چاہتے۔ وہ صرف اتنا ہی کہتا۔

''ہونی کو کون ٹال سکے ـــ''

لوگوں کی ہمدردیاں آہستہ آہستہ مذاق کا روپ دھار چکی تھیں۔ اب لوگ اسے دور سے ہی آوازیں لگاتے۔

''رحمت لنگڑے ـــ''

''او لنگڑے ـــ''

''اب لنگڑے کی اولاد ـــ''

رحمت کے دل پر گھونسے پڑتے۔ پر وہ مجبور تھا۔ رحمت کی غریبی کا مذاق اس وقت مزید اُڑا، جب دو سال بعد ہی اس کی بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ بھری پری دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ لوگ اُس سے طرح طرح کا مذاق کرتے۔

''لنگڑے تو، رنڈوا ہو گو''

''اب کون تیرے دانت دیکھے گو''

لوگوں کے جملے اس کے زخموں کو ہوا دیتے، وہ تلملا کر رہ جاتا۔

عرصے بعد رحمت کی زندگی میں خوشی کا کوئی پیغام آیا تھا۔ اُسے پتہ چلا کہ اس کے بابا نے اس کی دوسری شادی کی بات کی ہے۔ لڑکی کا شوہر مر چکا ہے۔ ایک بیٹا ہے۔ بابا نے لڑکی کے بیٹے کو اپنے یہاں لانے سے منع کر دیا۔ لیکن لڑکی کے بھائیوں وغیرہ نے شادی کی شرط ہی لڑکے کے ساتھ بدائی رکھ دی تھی۔ کافی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد رحمت کے بابا کو لڑکی والوں کی شرط ماننی پڑی۔

سادہ طریقے سے نکاح ہو گیا۔ فقیر محمد اپنی ماں کے ہمراہ رحمت کے گھر آ گیا۔

****

گاؤں صدر پور میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کسی عورت کے ساتھ، اس کا بیٹا بھی جہیز میں آیا ہو۔ جیسے رحمت نے شادی نہ کی ہو بلکہ گلا وٹھی کی پینٹھ سے ایک بھینس، کٹڑے سمیت

خرید لایا ہو۔ پورے گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں بھی فقیر محمد کے چرچے پھیل گئے۔ لوگ بے سبب بھی فقیر محمد کو دیکھنے آنے لگے۔ پہلی بار گاؤں میں ایسا ہوا کہ دلہن کی بجائے لوگ فقیر محمد کو دیکھنے آ رہے تھے۔ گویا فقیر محمد دنیا کی نئی نویلی خوبصورت دلہن ہو، اور رحمت کی شادی اس کی ماں سے نہیں فقیر محمد سے ہوئی ہو۔

تقریباً دس برس کا فقیر محمد، ان سب باتوں سے زیادہ باخبر نہیں تھا۔ اُسے تو یہ پتہ تھا کہ اُسے ماموں کے گھر سے نجات ملی ہے۔ لیکن لوگ اُسے حیرانی سے کیوں دیکھ رہے تھے۔ اس کے اندر ایسی کون سی بات تھی۔ اُسے خود پتہ نہیں تھا۔ اُس دن اُسے بڑی حیرانی ہوئی جب گاؤں کے ایک بے حد مذاقیہ ملکھان چاچا ان کے گھر آئے۔ اور آواز لگائی۔

''اے رحمت! کہاں ہے تو......''

رحمت کے بجائے فقیر محمد باہر آیا۔

''اچھا، تو ہو ہے۔ لونڈے، لینڈرا۔''

فقیر محمد کچھ نہیں سمجھ پایا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس دن کے بعد سے گاؤں میں اس کا نام لینڈرا پڑ گیا۔ چھوٹے، بڑے سبھی اُسے لینڈرا پکارتے۔

''او لینڈرے......''

تخاطب میں حقارت شامل ہوتی۔

فقیر لینڈرے...... یہ کام کر دے۔''

''اپنی ماں کے دہیج میں آیو لینڈرے......''

ہر نسل اور ہر شخص کا اپنا الگ انداز ہوتا۔ شروع شروع میں تو اُسے عجیب سا لگتا۔ اس کی شریانوں میں گرمی سی آ جاتی۔ غصے کی ایک رمق چہرے کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچ جاتی۔ لیکن جلد ہی رفو چکر بھی ہو جاتی۔ وہ بے بس تھا۔

****

وقت کا دریا بہتا رہا۔ لینڈرے کی ماں نے یکے بعد دیگرے دو بیٹے پیدا کیے۔

بھورا اور کلوا۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان کے نام ان کے رنگوں کے اعتبار سے گاؤں کے ان پڑھ لوگوں نے رکھ دیے تھے۔ رحمت کو اتنا ہوش کہاں تھا کہ وہ اپنی لنگڑی زندگی سے فرصت کے لمحات نکالتا اور دماغ کو اچھے ناموں کے لیے استعمال کرتا۔

بھورا بڑا تھا اور کلوا چھوٹا۔ دونوں بھائی اب جوانی کی سرحد میں داخل ہو رہے تھے۔ جوانی تو لینڈرا پر بھی آئی تھی، پر کب آئی، کب گذر گئی، اس کے نشان بھی باقی نہیں تھے۔ لینڈرا، سب کے لیے لینڈرا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی بھی اُسے لینڈرا ہی پکارتے۔ طرح طرح کے کاموں کے لیے حکم دیتے۔ لینڈرا پورے گاؤں کا بے اُجرت مزدور تھا۔ کوئی اُس سے حقہ بھرواتا، کوئی بوگے سے بھس نکلواتا، کوئی اپنی داڑھی بنواتا، کسی کی گائے بھینس، ہری کروانے لے جاتا، کسی کے کھیت سے برسن لاتا، کسی کے بچوں کو ٹیکہ لگواتا۔ عورتیں بھی لینڈرا سے اپنے ذاتی کام کرواتیں۔ لینڈرا سے کوئی عورت پردہ نہیں کرتی..... بازار جاتا تو سارے محلے کے گھروں کا سامان لاتا۔ حتیٰ کہ لینڈرا سے عورتیں میک اُپ کا سامان اور دیگر خفیہ چیزیں بھی منگوا لیتیں۔ لینڈرا سب کے سامان الگ الگ لاتا۔ کسی کا سامان رلتا نہیں تھا۔ کسی کی چھان ٹوٹ جاتی تو لینڈرا مزدوروں کے ساتھ جٹ جاتا۔ شادی بیاہ تو لینڈرا کی موجودگی کے بغیر تقریباً ناممکن تھے۔ ہر شادی میں اس کا ہونا ضروری تھا۔ برتن صاف کرنا، دسترخوان لگانا۔ کھانا شروع ہو جائے تو کھانا کھلواتا۔ کسی کو کھیت میں پانی لگوانا ہوتا تو لینڈرا ہی کام آتا۔ حتیٰ کہ میّت کے بہت سارے کام بھی وہی کرتا۔ ان تمام کاموں کے صلے میں کوئی بچا ہوا کھانا دے دیتا۔ کسی کے یہاں سے دھوتی مل جاتی۔ کسی کے یہاں سے کرتا۔ چائے تو وہ کسی کے بھی گھر پی لیتا تھا۔ ہر گھر کے اندر اس کا آنا جانا بے روک ٹوک تھا۔

اس کے اپنے گھر میں بھی بھورا اور کلوا زیادہ تر کام لینڈرا سے ہی کرواتے۔ حتیٰ کہ بھورا اور کلوا کی شادی کے وقت بھی لینڈرا ہی آگے آگے تھا۔ وہ بھائیوں کی ایک ساتھ شادی پر بہت خوش تھا۔ گویا اس کی ہی شادی ہو رہی ہو۔ ٹھیک یاد آیا۔ اس بیچارے کی شادی

کی تو بات بھی پیدا نہیں ہوئی۔ گھر، گاؤں اور پورے سماج نے پہلے ہی سے مان لیا تھا کہ لینڈرا شادی کے لائق نہیں ہے۔

گاؤں کی عورتیں، جن میں بزرگ عورتیں بھی شامل تھیں اور نو جوان لڑکیاں اور بہوئیں بھی، سب لینڈرا سے ایسی گھلی ملی تھیں جیسے لینڈرا انہیں کی نسل کا ہو۔ کسی کو لینڈرا کے مرد ہونے کا یقین نہیں تھا۔ وہ اس کی موجودگی میں اپنی خفیہ باتیں بھی کر لیتیں، بغیر دوپٹے اس کے سامنے آجاتیں۔ لینڈرا سے نہانے کا گرم پانی غسل خانے میں رکھواتیں۔ کبھی کبھی ہاتھ پاؤں بھی دبوا لیتیں۔

•••••••

بھورا اور کلوا کی شادی میں لینڈرا نے آگے بڑھ کے خوب کام کیا۔ سب لوگ بارات کے ساتھ گئے تھے اور لینڈرا کو گھر کی عورتوں کی رکھوالی کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ عورتوں اور لینڈرا نے مل کر دلہنوں کے استقبال کی تیاری کی۔ دو کمرے صاف کر کے سجائے گئے۔ بستروں پر خوبصورت چادر اور پھولدار غلاف والے تکیے۔ لینڈرا نے گیندے اور گلاب کے پھول اور کچھ ہری پتیاں لا کر انہیں بستروں پر بکھیرا اور گلاب جل بھی چھڑکا۔

رات کو ۱۲ بجے کے قریب بارات دلہنوں سمیت واپس آئی۔ رسموں کی ادائگی کے بعد سب نے اپنے اپنے بستر پکڑ لیے۔ دلہنوں کے کمرے بند ہو چکے تھے۔ بارات کا گھر تھا، کام کر کے سب تھک گئے تھے۔ جلد ہی گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ لینڈرا جاگتا رہا۔ وہ سب کے بستروں کا انتظام کرتا رہا۔ کسی کے پائنتیں چادر، کسی کے سرہانے تکیہ...... کہیں پانی کا لوٹا، بھر کے رکھا۔

"ارے او فقیرا"

بابا کی آواز پر وہ یادوں سے باہر نکل آیا "جی بابا" کہتا ہوا بھاگا۔ بابا نے اُسے حقہ بھرنے اور تازہ کرنے کو کہا تھا۔ اُسے بابا بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ اُسے فقیرا کہتے تو اُسے برا نہیں لگتا۔ بابا رحیم، رحمت کے والد تھے۔ وہ لینڈرا سے محبت کرتے تھے۔ اسی لیے جہاں

ساری دنیا اُسے لینڈرا کہتی تھی، بابا اُسے فقیرا کہتے...... اُسے ان کی چھوٹی سی سفید داڑھی بہت اچھی لگتی تھی...... رات کے دو بج رہے تھے۔ بابا کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ ویسے بھی وہ رات کو جاگتے تھے اور دن میں بیٹھک میں پڑے خراٹے بھرتے رہتے۔ وہ حقہ لیے اندر آنگن میں آیا۔ ہر طرف چارپائیاں بچھی تھیں۔ کسی پر ایک کسی پر دو دو لوگ سو رہے تھے۔ نل کے چبوترے پر حقہ رکھ کر اس کی فرشی کو اٹھا کر پانی گرا یا۔ نل سے پانی کھینچ کر اس نے فرشی کو خوب رگڑ رگڑ دھویا۔ نیچے کے ایک سرے سے پانی ڈالنا شروع کیا اور دوسرے سرے پر انگوٹھا رکھ لیا۔ پانی بھرنے کے بعد اُسے خوب آگے پیچھے ہلایا اور انگوٹھا ہٹا دیا۔ پورا پانی ایک رفتار کے ساتھ پیچھے آرہا گویا پتنالے کی مٹی ہٹا دی گئی ہو۔ فرشی اور نیچے کو خوب اچھی طرح تازہ کر کے اس نے برآمدے میں رکھا۔ تمباکو کی تھیلی سے تمباکو لیا اس کا گولا سا بنایا۔ چلم کے بیچوں بیچ رکھی چنغل پر رکھ کر اس کے اوپر توا رکھ دیا، جس کی پتلی سی زنجیر چلم کی گردن سے جڑی ہوتی تھی۔ اُسے یہ پتلی سی زنجیر بہت اچھی لگتی تھی۔ چلم کو سجا کر وہ اُسارے کے اُس حصے کی طرف بڑھا جدھر مٹی کا چولہا اور بروسی ہوتی تھی۔ بروسی میں ہر وقت آگ ہوا کرتی تھی۔ اس کی ماں رات کو بروسی میں اُپلے داب دیا کرتی تھی۔ پھر شادی کی رات تو چولہے بھی دیر تک گرم تھے۔ اس کا اندازہ تھا کہ آگ ضرور مل جائے گی۔ وہ اطمینان سے چولہے میں آگ تلاش کر رہا تھا۔ آگ میں تپے سرخ اُپلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کچھ کام تو بنا لیکن ابھی آگ کی کمی تھی۔ اس نے بروسی میں آگ ٹٹولی۔ چلم میں آگ پوری طرح رکھ کر جیسے ہی وہ پلٹا، اس کا پاؤں چمٹے پر پڑا۔ ''پڑاک'' کی آواز کے ساتھ ایسا لگا گویا کسی نے خاموشی کی کمر میں خنجر اتار دیا ہو۔ پاس ہی چارپائی پر حرکت ہوئی پھر کسی نے پکارا۔

''کون ہے......؟''

آواز کلوا کے ماموں کی شادی شدہ بہن کی تھی۔ جو شادی میں شریک ہونے ایک ہفتے سے آئی ہوئی تھی۔

''میں...... میں......''

''میں کون...... لینڈرا......''

''ہاں...... چلم بھرنے آیو تھو۔ (آیا تھا)''

لینڈرا کہنے پر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی گویا چلم کی آگ نے اس کے بدن کے بھٹے کو سلگا دیا ہو۔ نجانے کیوں وہ ایک عورت کے منہ سے لینڈرا سن کر جل گیا تھا۔

''ادھر کو آنا لینڈرے......''

''جی......''

وہ چارپائی کے پاس چلا گیا۔ پورا گھر محو خواب تھا۔ سناٹے اور خاموشی کی حکومت تھی۔ لینڈرا کے پاس آنے پر، پھر حکم ہوا،

''تھُ رکھ دے اور جرا مری ٹانگیں داب۔''

لینڈرا روبوٹ کی طرح شروع ہو گیا تھا۔ عورتوں کی ٹانگیں دبانے کا اس کا یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ اکثر اپنی اماں کی ٹانگیں دبایا کرتا تھا۔ اُسے اچھا لگتا تھا۔ اُسے خدمت کر کے خوشی ہوتی تھی۔

''لینڈرے جرا جور سے دبا۔ اور اوپر تک۔''

لینڈرا زور زور سے ٹانگیں دبانے لگا۔ اوپر کی طرف جب اس کے ہاتھ گئے تو اس کے بدن میں عجب سی چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ لینڈرا کو لگا جیسے اُسے ہلکا ہلکا بخار ہونے لگا ہے اور اس کے ہاتھوں میں جان نہیں ہے۔

''ارے کہاں مر گو فقیرا......''

بابا کی آواز پر لینڈرا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حقہ لے کر باہر آگیا۔ بابا نے حقہ کے انتظار میں ایک جھپکی لے لی تھی۔ حقہ دے کر وہ باہر ہی کونے میں پڑی جھنگولہ کھاٹ میں پڑ گیا۔ نجانے کب اس کا بخار کم ہوا اور کب نیند نے اُسے بے خبر کر دیا۔

اگلے دن گھر میں خاصی چہل پہل تھی۔ مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ لینڈرا کو

کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ خواب کی طرح وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

****

وقت کی ہوا کب رکتی ہے۔ پچھوا ہوا کی طرح فصلوں کو جلد پکا دیتی ہے۔ بچوں کو جوان اور جوانوں کو بوڑھا کرنا اس کا معمول ہوتا ہے۔ لینڈرا پچاس کے لپیٹے میں آ چکا تھا۔ اس کے بابا، اور اس کی ماں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کلوا اور بھورا اپنی اپنی زندگی گذار رہے تھے۔ لینڈرا کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ آج بھی گاؤں کے لیے لینڈرا ہی تھا۔ گاؤں میں کسی کے بھی چھول پڑتی، لینڈرا، ہل کٹی لیے کھیت میں ملتا۔ کھیت بونے کا وقت ہو یا فصل کاٹنے کا۔ کھلیان میں اناج نکالنے کی بات ہو، یا اناج کو دھڑی کے باٹوں سے تولنے کی...... لینڈرا ہر جگہ موجود ہوتا۔ لینڈرا کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا گویا پورا گاؤں ہی اس کا کنبہ ہے۔ لیکن اگلے ہی پل اُسے لینڈرا کہنے والے کچھ لوگ، برے بھی لگتے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اُن سب سے کہے کہ میں ہی اکیلا لینڈرا نہیں ہوں بلکہ تم سب لینڈرے ہو۔ تم سب اپنے باپوں کی اولاد نہیں ہو۔ تم سب کم اصل ہو۔ لیکن وہ یہ بات دل کے اندر ہی اندر کہتا اور سکون حاصل کر لیتا۔

ایک دن اس کے گھر میں کہرام مچا تھا۔ کلوا اور اس کی بیوی میں لڑائی ہو رہی تھی..... محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ کسی نے کلوا کو کہہ دیا تھا کہ تمہاری بیوی رامو کے بیٹے کے ساتھ کھیت میں رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ کلوا نے بنا تحقیق کیے گالیاں دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کی بیوی اپنی صفائی دے رہی تھی۔

''میں کھیت پر گئی ہی۔ نیار کاٹ کر گٹھری باندھ تو ئی پر موسو اُٹھی نا۔ پاس ہی رامو کا بیٹا کھیت میں پانی لگا رو تھو۔ میں نے گٹھری اُٹھوانے کو کہو۔ بس......... گٹھری اُٹھوانا جُرم ہے۔؟''

کلوا کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔

''چلی جا حرام جادی۔ جا میں نے تجھے طلاق دی۔''

''طلاق...... طلاق...... طلاق......''

طلاق کا گولہ منھ کی توپ سے نکل چکا تھا۔ گولے کی آواز اس قدر شدید تھی کہ اُس نے پورے گاؤں کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ گاؤں کا رُخ رحمت کے گھر کی طرف ہو گیا۔ بات گھر سے گاؤں پھر کھلیانوں اور کھیتوں سے ہوتی ہوئی جنگل اور دوسرے گاؤں میں پھیل گئی۔ علاقے میں پہلی بار کسی نے طلاق دی تھی...... گاؤں کے بزرگ کلوا کو لعن طعن کر رہے تھے۔

''پہلے جانچ پرکھ لینو چہیے۔''

''طلاق تو کھدا کو بھی بُری لگے ہے''

''اب جرور گاؤں پر آپھت آوے گی......''

جتنے منہ اتنی باتیں۔ شام ہوتے ہوتے بات کافی سنجیدہ ہو چکی تھی۔ لوگوں کے سمجھانے اور بُرا بھلا کہنے کا اثر کلوا پر بھی ہوا۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُس نے اپنی بیوی پر زیادتی کی ہے۔ پر اب کیا ہو؟ کسی طرح معاملہ رفع دفع ہونا چاہیے۔ گاؤں کے سمجھدار اور ہوش مند لوگوں کی میٹنگ ہوئی۔

''تین بار طلاق، کہنے سے بھی ایک ہی طلاق ہوتی ہے۔''

حافظ الیاس نے اپنی رائے دی۔

''امام صاحب سو پوچھ لیو۔ وہ کا کہویں۔''

''اہل حدیث کے کائی مولانا کے پاس چلو۔''

باہم مشورے سے طے پایا، جس میں امام صاحب بھی شامل تھے، کہ طلاق تو ہو گئی ہے۔ اب عدت پوری کی جائے۔ اور اس کے بعد حلالہ کرا کے دوبارہ کلوا کا گھر بسا دیا جائے۔

کلوا کی سسرال والے اپنی بیٹی کو لینے آئے تھے لیکن گاؤں کے لوگوں نے منع کر دیا۔ اور عدت بھورا کے گھر پوری کرنے کی بات طے ہو گئی۔

****

کیلنڈر کے تین ورق پلٹے جا چکے تھے۔ عدت پوری ہونے والی تھی۔ گاؤں کے

بزرگوں کا اجتماع پھر ہوا اور گاؤں کے کسی ایک شخص کی تلاش شروع ہوئی جو بڑی عمر کا ہو، نکاح کے بعد کی رات.......... کے بعد طلاق دے دے۔ لوگوں کی نظریں کئی اشخاص پر گئیں۔ خوبیوں اور برائیوں پر بحث ہوئی۔ مسجد کے امام پر سب کی رضا مندی ہونے ہی والی تھی کہ کسی بزرگ کی چشمِ تصور نے لینڈرا کو دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سب خوشی خوشی تیار ہوگئے۔ لینڈرا سے بہتر کوئی اور اس کام کے لیے نہیں ہوسکتا تھا۔ گھر کے گھر میں بات رہے گی اور لینڈرا سب کچھ ہمارے مطابق کر بھی دے گا۔

عشاء کے بعد امام صاحب نے لینڈرا کا نکاح پڑھوا دیا۔ دس پندرہ افراد کی موجودگی میں سب کچھ انجام پذیر ہوگیا۔ گاؤں کے بزرگوں نے کئی کئی بار لینڈرا کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں میں بھی کھسر پسر ہو رہی تھی۔ سبھی عورتوں کی رائے تھی لینڈرا تو لینڈرا ہے۔ کلوا کی قسمت اچھی ہے کہ حلالہ ہو کے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

لینڈرا کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے بستر میں سونے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے کہا۔

''یاں نہیں۔ آج تو تُو ے، اندر سو تو ہے۔''

اور مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق لینڈرا دُلہن کے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کی کنڈی لگاتے ہوئے وہ بستر پر آ کر ایک طرف کو لیٹ گیا۔ دوسری طرف منھ کیے دُلہن لیٹی تھی۔ لینڈرا کو کلوا کی شادی کی رات یاد آ گئی۔ اس کے جسم میں چیونٹیاں چلنے لگی تھیں اور وہ بخار میں تپ گیا تھا۔ بابا نے آواز نہ دی ہوتی تو نجانے اس کا کیا ہوتا۔ اس دن لڑکی نے اُسے اپنی طرف پکارا تھا۔ آج لڑکی منھ اُدھر کیے لیٹی تھی۔ شاید اُسے لینڈرا سے ڈر تھا۔ مارے خوف کے وہ دوسری جانب منھ کیے تھی۔ نہیں وہ لینڈرا سے خوف زدہ نہیں تھی، بلکہ انتہائی مطمئن.......... کہ لینڈرا بھی کوئی مرد ہے؟ اس اطمینان کے باعث وہ آرام سے منھ پھیرے لیٹی تھی...... پھر لینڈرا تو اس کا جیٹھ لگتا تھا۔

لینڈرا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن نیند اُس سے کوسوں دور تھی۔ جب کہ وہ

بستر میں گرتے ہی سو جایا کرتا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا...... جب نیند اس سے دور تھی..... پہلا ہی موقع تھا...... جب اس کی شادی ہوئی تھی......... شادی کیا ہوتی ہے؟ لینڈرا کو اس کا علم نہیں تھا۔ نہیں، علم تو تھا پر ادھورا ادھورا......... اُڑی اُڑی باتیں اُس نے سن رکھی تھیں۔ پہلی رات، یہ بھی اس کی زندگی کی شاید پہلی رات تھی...... نہیں شاید آخری بھی۔ پہلا موقع تھا جب اُسے گاؤں کی عزت کا واسطہ دیا گیا تھا۔ رحمت نے اُسے اپنے خاندان کی عزت کی دُہائی دی تھی...... رحمت، اس کی ماں کا شوہر......... جس نے اُسے نئی زندگی دی تھی، نہ صرف اُسے بلکہ اس کی ماں کو بھی...... جو آج بالکل قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا.........

پھر کلوا بھی تو اس کا بھائی ہی تھا، اس کی ماں کا بیٹا....... نکاح کے وقت کلوا کی آنکھوں میں تیرتے آنسو جو التجا کر رہے تھے، اُسے سب یاد تھا....... اُسے تو بس آج رات گزار کر، گاؤں کی عزت، گاؤں کے حوالے کرنی تھی۔ وقت نے کیسی کروٹ بدلی تھی۔ آج وہ گاؤں کی عزت کا محافظ بن گیا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گاؤں کے بڑے، جوان، عورتیں سب کو اُمید تھی، ہونا وہی ہے جس کا سب کو اندازہ تھا....... لینڈرا کا انتخاب اسی پس منظر میں کیا گیا تھا۔ گاؤں کے بزرگوں نے دنیا دیکھی تھی، ان کی نظروں میں لینڈرا اس کام کے لیے مناسب ترین شخص تھا۔ لینڈرا کے تقریباً ۴۰ سال ان کی آنکھوں کے سامنے تھے... اس نے کبھی کسی لڑکی کو نظر بھر کا بھی نہیں دیکھا تھا۔

چار پائی نما پلنگ کی نواڑ میں سرسراہٹ ہوئی۔ دُلہن نے شاید کروٹ لی تھی۔ لینڈرا کا دل تیز دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اس کے اندر اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ کروٹ بدل کر دیکھ لے کہ دُلہن کس کروٹ لیٹ چکی ہے..... آہستہ آہستہ اس کی حالت ٹھیک ہونے لگی۔ دل کی دھڑکنیں سست ہونے لگیں۔ دل نے سمجھایا دیکھو تو سہی..... وہ کیا کر رہی ہے؟ سو رہی ہے یا سونے کی ایکٹنگ کر رہی ہے یا پھر میری طرح .... نہیں..... نہیں..... میری طرح کیسے ہوگی۔ وہ تو اس دور سے گذر چکی ہے۔ ہم بستری کا بھی اس کا یہ پہلا موقع نہیں۔ نہیں وہ میری طرح تو نہیں ہوگی۔

اپنی تمام قوت کو سمیٹتے ہوئے اُس نے سر گھما کر دیکھا۔ پھر فوراً سر کو واپس موڑ لیا۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اُسے دیکھتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ لینڈرا نے دیکھا تھا...... دُلہن نے کروٹ بدل کر رُخ سیدھا کر لیا تھا۔ اب اس کا منہ اور سامنے کا حصہ چھت کی طرف اور پشت پلنگ پر تھی۔ اور وہ مزے سے سو رہی تھی۔ سوتے میں اس کی سانسوں کی آمد و رفت سے اس کا سینہ کچھ اس طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا کہ لینڈرا کی سانسیں تھمنے لگیں۔ حلق خشک ہو گیا۔ اگر اُس نے فوراً سر نہ گھما لیا ہوتا تو شاید اس کا دل، دھڑکنا بھول جاتا۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اُسے کیا پتہ تھا عورت کی قربت کیا ہوتی ہے۔ قربت کی تپش کیسی ہوتی ہے۔ کیسے وہ اچھے اچھوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اُسے بھی جلا ہی تو دیا تھا۔ اس کا بدن تپنے لگا تھا۔ اُسے زندگی میں اتنی گرمی کبھی نہیں لگی تھی۔ جیٹھ کی بھری دوپہری میں کھیتوں میں کام کرتے وقت بھی اُسے اتنی گرمی کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔

اچانک اس کے اندر برسوں پرانا فقیر محمد، بیدار ہو گیا۔ اُسے یاد آنے لگا، سارا گاؤں اُسے لینڈرا کہتا تھا۔ جب شروع میں لوگوں نے اُسے لینڈرا کہنا شروع کیا تھا تو اُسے بہت غصہ آتا تھا۔ لیکن اس کی بے چارگی اور بے بسی نے انہیں مزید تقویت پہنچائی تھی۔ آج لوگ اس کے اصل نام کو بھی بھول گئے تھے اور لوگوں کا کیا وہ خود فقیر محمد سے دور ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ عام ہوتا گیا، لیکن کہیں نہ کہیں اس کے دل میں نفرت کی ایک چنگاری تھی جو برسوں سے دبی پڑی تھی۔ اچانک چنگاری سُلگ اُٹھی۔ لینڈرا، کے اندر خود اعتمادی، حوصلہ اور ہمت آ گئی تھی۔ گاؤں والے اُسے ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہمیشہ اس کی تضحیک کرتے۔ لینڈرا کہتے وقت ان کے لہجے میں کیسی حقارت ہوتی تھی۔ فقیر محمد بے بس تھا۔ لیکن انسان ہمیشہ بے بس نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ہر انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی دولت، شہرت، موقع، ہمت اور حوصلہ ضرور عطا کرتا ہے۔ آج فقیر محمد کو خدا نے وہ موقع دیا تھا۔ خدا نے آج اُسے فقیر سے بادشاہ بنا دیا تھا۔ اُسے ایک رات کی بادشاہت ملی تھی۔ فقیر محمد نے طے کر لیا کہ وہ انتقام لے گا۔ وہ

گاؤں والوں کو بتائے گا کہ لینڈرا کسے کہتے ہیں۔ اُسی بچے کو تا، جو اپنی ماں کے ساتھ جہیز میں آتا ہے۔ آج میں بتاؤں گا۔ عزت کیا ہوتی ہے۔ کلوا، جو میرا بھائی ہے۔ اس نے بھی کیا کمی کی۔ وہ بھی مجھے لینڈرا کہتا ہے۔ آسے آج پتہ چلے گا کہ لینڈرا کیا ہوتا ہے۔ لینڈرا بزدل، کمزور اور ڈرپوک نہیں ہوتا۔ آج میری ہمت دیکھنا کلوا...... اور کلوا کی بیوی...... آج رات کی اس کی دُلہن...... کتنے اطمینان سے محوِ خواب ہے۔ گویا شادی کی پہلی رات، کوئی بات ہی نہ ہو۔ کتنا اطمینان ہے حرام زادی کے چہرے پر...... کیوں ہے یہ اطمینان، صرف اس لیے نا کہ میں لینڈرا ہوں۔ لینڈرا جو شاید مرد نہیں ہوتا۔ گاؤں کی ساری عورتیں مجھے یہی سمجھتی ہیں نا۔ انہیں یہ نہیں پتہ لینڈرا، مرد ہے، لیکن بدکردار نہیں۔ کبھی کسی لڑکی کو نہیں چھیڑا، کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں مرد نہیں...... نامرد ہوں۔ سارے گھر کو، پورے گاؤں کو اطمینان ہے۔ سب مجھے نامرد سمجھتے ہیں...... آؤ، گاؤں والو دیکھ لو...... میں نامرد نہیں ہوں۔

رات کے پچھلے پہر لینڈرا کے کمرے سے ابھرنے والی چیخوں اور کراہوں نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد لینڈرا، نہیں فقیر محمد، جو آج بادشاہِ وقت سے کم نہ تھا، نے حسبِ وعدہ گہنا چکے چاند پر اپنے دروازے ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیے۔

☆☆

اندھیرا ابھی زندہ ہے

تانگے کے پہیوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں مل کر بڑی مدھر موسیقی پیدا کر رہی تھیں۔ موسم بھی شباب پر تھا اور اپنی مستی لٹا رہا تھا۔ بادلوں کے کچھ آوارہ جھنڈ نیل گگن میں آوارگی اور سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کے کھیل میں مگن تھے۔ پچھوا ہوا کے جھونکے جسم کو فرحت اور تازگی بخش رہے تھے۔ سڑک کی دونوں جانب تا حد نگاہ گندم ہی گندم نظر آرہا تھا۔ فصل پکی کھڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا۔ گویا زمین پر سونے کی پالش کر دی گئی ہو۔

''اور کتنی دور ہے مہاراج پور؟''

''ارے بابو! بس آنے والا ہے۔ یہ سہکاری مگر دکھ رہا ہے نا اس کے ایک میل بعد مہاراج پور ہے۔ کا پہلی بار جا رہے ہو؟''

''نہیں کئی سال بعد آیا ہوں کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔''

''کا بابو! آپ بھی گجب ہیں۔ کا بدلا ہے کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ وہی کھیت، وہی کسان۔ وہی سڑک.....''

اور پھر تانگے والا شروع ہو گیا۔ جاوید کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ دوسری سواریاں بھی اسے دیکھنے لگی تھیں۔ اس نے اپنی نظروں کو دور بہت دور افق پر مرکوز کر دیا۔ آہستہ آہستہ تانگے اور گھوڑے کی آواز کا جادو اس کی سماعت سے دور ہوتا گیا اور وہ سوچ نگر

میں داخل ہو گیا۔

....

دھنورا گاؤں میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ جب وہ پڑھنے کے لائق ہوا تو اس کے والد، جنھیں لوگ ''بابو جی'' کہتے تھے، بہت دور شہر میں پڑھنے کے لیے لے گئے۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے بابو جی گاؤں کے پہلے شخص تھے، جنھوں نے ملازمت کی تلاش میں گاؤں چھوڑا تھا اور دور دراز کے شہر ناگر میں جا بسے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ کئی سال تک گاؤں واپس نہ آئے پھر جب کام چل نکلا تو گاؤں آنے لگے۔ وہاں سے گاؤں تک آنے میں انہیں تین دن لگتے، جب کبھی وہ گاؤں آتے گاؤں کے لوگ انہیں گھیر لیتے اور ان سے شہر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پوچھتے اور انہیں ایک بہت ہی قابل شخص سمجھ کر خاموشی سے ان کی باتیں سنتے، جب کہ وہ معمولی پڑھے لکھے تھے۔ جب وہ شہر گیا تو اسے بابو جی نے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ ہر سال کامیابی کی پیٹھ پر سوار وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ پہلی بار جب اس نے گاؤں میں دادا کے نام خط لکھا تو گاؤں میں سب نے خوشی منائی تھی پھر تو جیسے خطوط کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔ بابو جی نے خود خط لکھنا بند کر دیا۔ وہ اکثر اسی سے خط لکھواتے۔

بابو جی کے شہر جانے سے اس کا خاندان دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ گاؤں میں دادا، دادی، امی، چھوٹی بہن اور بڑے بھائی تھے اور شہر میں بابو جی، وہ اور ایک چھوٹا بھائی۔ اب سال میں ایک دو بار شہر سے گاؤں آنا جانا ہونے لگا تھا۔ بابو جی دو مہینے قبل ہی گاؤں گئے تھے۔ لیکن جب وہ گاؤں سے واپس آئے تو بیماری بھی جونک کی طرح ان سے چپٹی چلی آئی تھی۔ انہیں ٹی بی کا مرض ہو گیا تھا۔ گاؤں میں وہ کہہ کر آئے تھے کہ شہر میں علاج کراؤں گا اور آ کر انہوں نے علاج بھی کروایا۔ طبیعت سنبھل گئی تھی۔ طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد انہوں نے خط لکھنے کو کہا کہ خیریت نامہ بھیج دو۔ اس کے امتحان چل رہے تھے۔ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس نے کئی دن بعد خط ڈالا تھا۔ خط ڈالے ہفتہ ہوا ہو گا کہ اس کے امتحان ختم

ہو گئے۔ بابو جی نے کہا۔

''تم گھر ہی چلے جاؤ۔''

اسے بھی ماں کی یاد آ رہی تھی۔ اسے گاؤں گئے ہوئے بھی کئی سال ہو گئے تھے۔

''بابو! کیا سو گئے۔ مہاراج پور آ گیا۔''

تانگے والے کی آواز نے اسے سوچ فکر سے نکال کر مہاراج پور میں لا کھڑا کیا۔ وہ جلدی سے تانگے سے اترا۔ اپنا سامان لیا اور کچے راستے پر ہو لیا۔ شام ہونے والی تھی۔ سورج مارے شرم کے افق کی گود میں سمائے جا رہا تھا، لیکن اس کی سرخی آسمان کو سرخاب کر رہی تھی۔ پکی سڑک سے گاؤں کوئی دو کلومیٹر ہوگا۔ پہلے اسے یہ دوری کئی سو میل لگا کرتی تھی، لیکن آج اس کے قدموں میں نہ جانے کہاں سے طاقت آ گئی تھی۔ شاید ماں سے ملنے کی شدید آرزو اسے رفتار بخش رہی تھی۔ دراصل انسان جب کسی آرزو یا امید کا دامن تھامے چلتا ہے، تو راستے سمٹ جاتے ہیں اور طویل سفر بھی لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔

کاندھے پر وزنی بیگ لٹکائے جاوید جب اپنے گھر پہنچا تو اسے عجیب منظر نظر آیا۔ ہر طرف اداسی، مایوسی اور تنہائی کا عالم تھا۔ بیٹھک پر، جہاں ہر وقت چہل پہل رہا کرتی تھی، سناٹا پہرہ دے رہا تھا۔ پہلے جب وہ آتا تھا تو اس کے چھوٹے بھائی، بہن، دوست سب دور ہی سے خوشی سے چلا اٹھتے تھے۔ بابا دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیتے تھے۔ ماں باہر آ کر سر پر ہاتھ پھیرا کرتی تھی اور بوڑھی دادی تو دعاؤں کی پوٹلی کھول کر بیٹھ جاتی تھیں۔ آج وہ بیٹھک تک بھی پہنچ گیا تھا، لیکن اب تک اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ بیٹھک سے گزر کر جب وہ اندر آنگن میں پہنچا تو وہاں لوگوں کو جمع پایا۔ صورتیں لٹکی ہوئی، آنکھوں میں آنسو.....وہ ٹھٹھک گیا۔

''کہیں بابا کا انتقال.....''

یہ خیال اس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا اور اسے بری طرح لرزا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ زور سے سلام کیا کرتا تھا۔ جیسے ہی اس نے سلام کرنے کو منہ کھولا۔ چھوٹی بہن کی نظر اس پر پڑ گئی۔

''بھیا.....!''

وہ بہت زور سے چیخی اور زار و قطار رونے لگی۔ پھر کیا تھا سب نے اسے گھیر لیا اور زور شور سے رونے اور آہ و بکا کرنے لگے۔ وہ معاملے کو سمجھ نہیں پایا اور خود بھی گریہ وزاری میں شامل ہو گیا۔

کسی بھی چیز کی ایک حد ہوتی ہے، ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو ختم ہو جاتا ہے، ہنسی بھی جب حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تب رونے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور جب آدمی خوب روتا ہے تو آنسو خشک ہو جاتے ہیں، گلا ساتھ نہیں دیتا۔ پھر انسان خود کو عام حالات کی طرف موڑ لیتا ہے۔ جب رو رو کر آنکھیں خشک ہو گئیں، آواز بیٹھ گئی تو فضا میں خاموشی کا سکہ جمنے لگا اور آہستہ آہستہ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ سبھوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے، لیکن اب خاموشی نے جو سکہ جمایا تو ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ سبھی خاموش تھے۔ گویا کسی جادوگر نے انہیں پتھر کا بنا دیا ہو، کسی میں خاموشی کو توڑنے کی ہمت اور جرأت نہ تھی۔ بالآخر جاوید نے خاموشی کو گویائی سے ہمکنار کیا اور بڑے بھائی سے مخاطب ہوا۔

''کیا بات ہے یامین بھائی؟ بات تو بتایئے۔''

''وہ.....تمہارا.....خط.......''

وہ بات پوری نہیں کر پائے اور رونے لگے۔

''ہاں میرا خط.....کیا ہوا اسے.....؟''

''آج ہی آیا ہے.......بابو جی کا انتقال ہو گیا نا...؟''

''ایں! کیا کہا؟ میں تو انہیں کل تک ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر آیا تھا۔''

جاوید کے اس جملے پر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ بابا نے اسے پکڑ لیا۔

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے نا۔ میرا اینا زندہ ہے؟''

''میرا لعل زندہ ہے.......؟''

بوڑھی ماں کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"جاوید تیرے بابوجی زندہ ہیں نا..؟"

ماں کی آواز حلق کے اندر سے آئی۔

"ہاں بھائی سب ٹھیک ہے۔ان کا علاج چل رہا تھا۔اب وہ بالکل صحت مند ہیں اور میں نے خط میں ان کی خیریت ہی لکھی تھی۔"

"تم نے پتہ لال روشنائی سے لکھا تھا ہم سمجھ گئے کہ بابوجی کا.....تم اتنا پڑھ لکھ گئے ،لیکن عقل نہیں آئی۔اتنا بھی نہیں جانتے کہ لال روشنائی سے صرف موت کی خبریں ہی بھیجی جاتی ہیں۔"

وہ حیرت سے اپنی یا دوسروں کی کم عقلی کا ماتم کررہا تھا اور دور افق پر سرخ رنگ مسکرا رہا تھا۔

☆☆

دن کے اندھیرے ، رات کے اجالے

میں قبرستان ہوں۔آپ مجھے ضرور جانتے پہچانتے ہوں گے۔کبھی نہ کبھی آپ ضرور یہاں آئے ہوں گے۔آپ کسی جنازے کے ساتھ میرے احاطے میں آئے ہوں گے،شب برات میں تو ضرور کسی قبر پر فاتحہ پڑھنے یا چراغاں کرنے آئے ہوں گے۔میری ویرانی کو دیکھ کر آپ کو ڈر بھی لگا ہوگا۔موت یاد آئی ہوگی۔آپ نے گناہوں سے توبہ کے لئے استغفار کیا ہوگا۔لیکن مجھے پتہ ہے کہ مجھ سے دور ہونے پر آپ نے ساری قسمیں اور وعدے ،توڑ ڈالے ہوں گے۔کوئی بات نہیں ،یہ دنیا اور زندگی تو عمل کی جگہ ہے۔آپ جیسا عمل کریں گے ،بعد میں ویسا ہی اجر پائیں گے۔ایک راز کی بات بتاؤں۔غور سے سننا۔ اچھا پہلے میں اپنا تفصیلی تعارف کرادوں۔میں بلند شہر کے گاؤں دھنورا کا قبرستان ہوں۔ میری عمر یہی کوئی ۴۰۰ سال ہوگی۔ابھی کم عمری ہی میں ،میرا سینہ فخر سے بلند ہے کہ میرے سینے میں ہزاروں راز دفن ہیں۔میں گاؤں کے مغربی کنارے پر آباد ہوں۔ویسے تو میرا سینہ اندرونی طور پر مسلمانوں سے آباد ہے لیکن باہری سطح پر مسلم اور غیر مسلم دونوں نے میری ظاہری ویرانی کو کم کر رکھا ہے۔صدیوں سے گاؤں کے لوگ میرے سینے پر مونگ دلتے ۔۔۔۔۔نہ۔۔۔۔نا۔۔۔۔میری زبان پھسل گئی ،گاؤں کے لوگ اپنے روزمرہ کے کام کاج کرتے آرہے ہیں۔میں انہیں کھیلتا کودتا دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہوں کہ چلو کچھ دن کھیل لو،

پھر تو میرے سینے میں ہی ہمیشگی کی زندگی گذارنی ہے۔

ہاں تو، لو آج میں تمھیں اپنی داستان سناتا ہوں۔ غور سے سنو! کوئی درمیان میں نہیں بولے گا۔ جب تک میں خود ہی آپ کو مخاطب نہ کروں۔

سبھی خاموش ہو گئے۔ زمین، آسمان۔ ہوائیں گھٹائیں، چرند، پرند، انسان...... سب خاموش اور ہمہ تن گوش ہو گئے۔

"یہ دوال میری لاش پر بنے گی۔"

عزیز بھائی کی آواز پر پورا مجمع چونک کر انھیں دیکھنے لگا تھا۔ وہ غصہ سے آگ بولا، اپنی دھوتی کو گھٹنے سے اوپر کئے۔ دیوار کی کھدی ہوئی بنیاد میں کھڑے تھے۔ ان کے تیور اور بزرگی کو دیکھتے ہوئے، بابوجی نے بھیڑ کو روکا، پھر پیچھے گھوم کر دیوار بنا رہے مزدوروں سے بولے۔

"بھئی کام روک لو۔ ذرا دیر سانس لے لو۔"

کام رک گیا تھا۔ سب حیرانی سے بنیاد کی نالی میں کھڑے عزیز بھائی کو دیکھ رہے تھے۔ دراصل دھنورا کے قبرستان کی چہار دیواری کا کام چل رہا تھا۔ زمانے سے قبرستان کی اراضی یوں ہی پڑی تھی۔ ایک کونے میں قبریں بنائی جاتیں، برسوں بعد دوسرے کونے کی باری آتی۔ قبرستان کی زمین دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ قبریں بہت کم تھیں۔ زیادہ تر قبریں کچی مٹی کی تھیں اسی لئے جلد برابر ہو جاتی تھیں۔ قبرستان میں صرف ایک پختہ قبر تھی۔ یہ گاؤں کے منشی سجاد حسین کی قبر تھی۔ سنا ہے کہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ پاس کے قصبے کے اسکول میں مدرس تھے۔ بڑے نیک دل اور خدا ترس انسان تھے۔ بے شمار شاگردوں کو پڑھا لکھا کر زندگی گذارنے کے لائق بنا دیا۔ ان کی قبر کے چاروں طرف نو رانچ کی اینٹوں کی دیوار تھی اور ایک طرف لوہے کا گیٹ لگا تھا۔ اندر بیلا کے پیڑ تھے۔ جن پر بارہ مہینے سفید پھول کھلا کرتے تھے۔ لوگ صبح صبح قبرستان آتے تو منشی جی کی قبر سے پھول ضرور لے کر

جاتے۔ قبرستان، دھنورا کے لوگوں کے دلوں کی طرح کشادہ تھا۔ قبرستان میں لوگوں نے اپنے اپنے بونگے، بٹورے، کوڑیاں بنا رکھی تھیں قبرستان مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے بھی استعمال میں آتا تھا۔ بیساکھ آتا تو گیہوں کی پولیوں کے انبار قبرستان میں ہر طرف دکھائی دیتے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان۔ سب کے لانگ (فصل کے انبار) قبرستان میں رکھے جاتے۔ پہلے تو بیلوں سے لانگ سے گیہوں نکلوانے کا کام کیا جاتا تھا۔ کئی کئی دن کی دائیں (بیلوں کے ذریعہ اناج نکالنے کا عمل) کے بعد بیلوں کے پیروں سے گیہوں کی سوکھی پولیوں کا چورا ہو جاتا تھا پھر اسے تیز ہوا کے رخ پر برسا کر بھس اور گیہوں کو الگ کیا جاتا۔ قبرستان کے پورب میں گاؤں کے گڈریے رہتے تھے، اتر کی طرف ڈگڑا (کچا راستہ) اور اس کے بعد مسلمان لوہار، بڑھیوں کے مکان تھے۔ دکھن کی طرف گوجروں کے کھیت تھے۔ جبکہ پچھم کی طرف کسائیوں آباد تھے۔ صدیوں سے قبرستان گاؤں کی خوشحالی کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ کسی کی موت ہوتی تو ضرور غم کا ماحول چھا جاتا۔ خود ہی قبر کھودتے اور مردے دفناتے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن خدا سیاست دانوں کو غارت کرے۔ فرقہ پرستی کا ایسا زہر گھولا کہ نفرتوں کی فصل ہر طرف لہلہانے لگی۔ صدیوں سے آپسی میل جول سے رہتے آ رہے گاؤں کے سیدھے سچے لوگوں میں بھی نفرت، خوف ڈر، دہشت، مذہبی جنون اور فرقہ پرستی کے سنپولے پلنے لگے۔

"بابوجی اب کیا ہوئے گو؟"

کنور پال نے بابوجی کو آواز لگائی تو وہ خیالات کے دھندلکے سے باہر آئے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے عزیز بھائی کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے پیچھے چاچا ملکھان، سری گر چاچا، رام چندر کے علاوہ دس بارہ ہٹے کٹے نوجوان لاٹھی بلم لیے ساتھ ہو لیے۔ رام چندر نے لاٹھی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بڑے غصے سے کہا۔

"بابوجی۔ آپ اک اور کو ہو جاؤ۔ میں ابھی گرا دن گو، یا کی لاش.......... دوال تو بن کر رے گی۔"

ایک ہاتھ سے رام پال کی لاٹھی پکڑتے ہوئے بابو جی نے رام پال کو ڈانٹا۔

''پاگل نہ بنو۔ خون خرابے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' پھر وہ عزیز بھائی سے مخاطب ہوئے۔

''ہاں بھئی کیا بات ہے؟ جب تمہیں سمجھا دیا تھا تو پھر کیا آفت آ گئی۔ دیکھو یہ قبرستان کا کام ہے۔ ثواب کے بدلے میں گناہ نہ کما۔''

عزیز بھائی اب بھی بنیا دکی نالی میں کھڑے تھے۔

''پہلے میری کوڑی کو کوئی انجام کرو۔ جب جن دن گو۔''

عزیز بھائی کی بات پر ایسے اور بھی مسلمان سامنے آ گئے تھے جن کے کام قبرستان میں ہوا کرتے تھے۔ غریب مسلمانوں کے پاس تھوڑی سی زمینیں تھیں۔ کچھ دوسروں کے کھیتوں پر کام کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ چہار دیواری نہ ہونے سے قبرستان کی زمین سب کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ دو بنیا بھی قبرستان کے بیچوں بیچ سے گذرتی تھیں۔ شادی بیاہ ہوتے تو قبرستان کی زمین کا استعمال کیا جاتا۔

گاؤں دھنورا ضلع بلند شہر کا ایک ہندو اکثریتی گاؤں تھا۔ یوں تو گاؤں میں گوجر، گسائیں، گڈریے، ہریجن، ٹھاکر، شیخ، لوہار، بڑھئی، دھوبی بھی رہتے تھے لیکن گاؤں میں گوجروں کا دبدبہ تھا۔ ایک تو گوجر تعداد میں زیادہ تھے دوسرے مال و دولت، زمین جائیداد کے معاملے میں وہ دوسری قوموں سے کہیں آگے تھے۔ اسی سبب دھنورا، آس پاس کے علاقے میں گوجروں کے گاؤں کے نام سے بھی مشہور تھا۔

دھنورا میں مسلمان کم تعداد میں تھے۔ یہاں کے آبائی مسلم باشندے شیخ، لوہار اور بڑھئی تھے۔ شیخ خاندان کے لوگ سوانگ، نوٹنکی، گانے بجانے اور حقہ کے نیچے بنانے کا کام کرتے تھے۔ جبکہ لوہار اور بڑھئی گاؤں والوں کے کھیتی کے اوزار اور روزمرہ کے سامان بناتے تھے۔ یہ کام دو طرح کی اجرت پر ہوتے تھے۔ زیادہ تر کسان سال بھر اپنا سامان بنواتے اور فصل کے وقت دو من یا چار من اناج بطور اجرت دیا کرتے۔ اناج کے علاوہ

بھس، ہرا چارہ، اور دیگر سامان بھی کسان کبھی کبھار بھیج دیا کرتے تھے۔ دوسرے چھوٹے موٹے کام، بہت سے لوگ نقد بنوا لیتے۔ جن کے بدلے فوری طور پر اناج یا کوئی دوسرا سامان دے جاتے۔

گاؤں میں آپسی میل جول بہت تھا۔ صدیوں سے ہندو مسلم شیر و شکر کی طرح رہتے آئے تھے۔ شادی بیاہ میں ایسی شرکت کرتے کہ لگتا ہی نہیں دو ہیں۔ گاؤں کے دامادوں کی یکساں خاطر ہوتی۔ مسلمانوں کی بیٹی اور داماد آتے تو غیر مسلم اپنے بیٹی داماد جیسا سلوک کرتے۔ مسلمان کسی گاؤں میں جاتے تو وہاں گاؤں کی بیاہی بہن۔ بیٹی کو تحفے اور نذرانے دے کر آتے۔ بچے گاؤں کے سبھی بڑوں کو چاچا، تاؤ، بابا کہہ کر پکارتے۔ گاؤں میں کسی کے اکھ بونے کا وقت ہوتا تو پورے گاؤں میں چہل پہل ہوتی۔ کچھ دن قبل ہی کی بات ہے ترکھا بابا کے یہاں اکھ بوئی جانے والی تھی۔ ایک دن پہلے ہی گاؤں میں خبر کر دی گئی۔

''بھئی کل، باگ والے کھیت میں اکھ بووے گی۔ جرور آئیو۔''

اور اگلے دن صبح صبح بابا ترکھا کے کھیت پر خاصی بھیڑ موجود تھی، کئی لوگ مل کر گانڈے (گنے) کے ایک ایک فٹ کے ٹکڑے، بیج کیلئے کاٹ کر ڈھیر لگا رہے تھے۔ بیلوں کی چار جوڑیاں کھیت جوت رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے چار لوگ گانڈے کے ٹکڑے ڈالتے اور ہیر سے دابتے چلے جاتے۔ کچھ لوگ گانڈے کے ڈھیر سے، اکھ بونے والوں کو گانڈے لا لا کر دے رہے تھے۔ چار بیگھہ کھیت میں اکھ بونے کا کام دس بجے تک پورا ہو گیا تھا۔ آخر میں کھیت میں بکھرے کوڑ کباڑ اور اوزاروں کو اکٹھا کیا گیا۔ اتنے میں ترکھا بابا کی آواز گونجی۔

''سب گھر چلن گے۔ کھیر پوری کی دعوت ہے۔''

بس پھر کیا تھا۔ بچے بوڑھے مرد عورتیں سب اپنا اپنا سامان سمیٹ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ترکھا بابا کے گھر ایک دن پہلے ہی سے اکھ کی دعوت کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ کئی گھروں سے دودھ، رات ہی میں جمع کر لیا گیا تھا۔ صبح صبح گاؤں کی عورتیں اور

ترکھا بابا کی بہوویں کھیر اور پوری کی تیاری میں لگ گئی تھیں۔ بیٹھک کی زمین کو ایک دن پہلے ہی گوبر اور مٹی سے اچھی طرح لیپ دیا گیا تھا۔ بیٹھک کا فرش ایسا لگ رہا تھا گویا پورے فرش پر سونے کا پانی چڑھا دیا گیا ہو۔ جلد جلدی لوگ آمنے سامنے قطاروں میں اکڑوں بیٹھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں کھانا کھلانے والے آگئے تھے۔ کوئی پتل بچھا رہا تھا۔ کوئی بالٹی سے کھیر نکال کر پتل پر انڈیل رہا تھا۔ اس کے پیچھے پوریاں دینے والے تھے۔ مٹی کے سکوروں میں پانی رکھ دیا گیا تھا۔

بابو جی کی گرج دار آواز سنائی دی۔

"جس کے پاس نہ آیا ہو وہ مانگ لے۔ باقی پڑھو بسم اللہ۔"

سب نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ یہ نظارہ شادی کے کھانوں کے وقت بھی نظر آتا تھا۔

گاؤں میں کسی ہندو کی موت ہو جاتی تو مسلمان ہندو سب مل کر ارتھی تیار کرتے اور کاندھا دیتے ہوئے شمشان گھاٹ جاتے۔ عجیب اتفاق تھا کہ گاؤں میں شمشان گھاٹ کی زمین پر آس پاس کے ہندوؤں نے ہی آہستہ آہستہ قبضہ کر لیا تھا۔ اب کھڑنجے پر انتم سنسکار ہوا کرتا تھا۔ بہت کوششوں کے بعد بھی شمشان کی زمین نہیں مل پائی تھی۔ گاؤں میں دو مندر تھے، مسجد نہیں تھی۔ لیکن قبرستان بہت پہلے سے تھا۔ کسی مسلم کی موت ہوتی تو ہندو مسلم مل کر قبر کھودتے۔ قبرستان کے ہی درختوں کی موٹی شاخیں کاٹی جاتیں، ان کے موٹے موٹے ٹکڑوں کو میت کے اوپر قبر کے بگدے میں لگایا جاتا، پھر گھاس پھوس سے لکڑیوں کے درمیان کی درز کو بھرا جاتا اور مٹی ڈالی جاتی۔ سرہانے کسی سایہ دار پیڑ کی ٹہنی لگا دی جاتی۔

قبرستان کی چہار دیواری کا سلسلہ بابو جی نے اٹھایا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ملک کا ماحول خراب ہوتا جا رہا تھا، ایسے میں قبرستانوں اور مساجد کی حفاظت بہت ضروری ہو گئی تھی۔ دوسرے قبرستان کے دکھن میں گوجروں کے کھیت تھے۔ جن میں کئی نے اپنے گھیر اور گھر بنانا شروع کر دئے تھے۔ اس بات کا خطرہ بڑھ گیا تھا کہ دکھن کی طرف سے

آہستہ آہستہ قبرستان سکڑنے نہ لگے۔ لیکن قبرستان کی چہار دیواری کی بات پر گاؤں میں نئی قسم کی ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ کچھ مسلمانوں نے ہی اس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ گاؤں کے بزرگ اور سمجھدار مسلمانوں کو بابو جی نے اس بات کی اہمیت سمجھائی۔

"دیکھو بھئی...... ملک کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں۔ ہندو مسلم منافرت پھیلتی جا رہی ہے۔ گاؤں میں تو خیر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ پھر بھی قبرستان کو آگے تک بچانا ہے تو اس کی چار دیواری کرانی ہوگی۔"

"بات تو سہی کہو ہو بابو جی۔" بابا بشیر بولے۔

"دھرم ویر نے قبرستان کی پلی اور اپنا گھیر بھی بنوالیو ہے۔ موئے تو وا کی نیت پر شک ہووے ہے۔" چاچا نثار دور کی کوڑی لائے تھے۔

"ٹھیک ہے تو یا کام کو جلد شروع کرواؤ باؤ جی۔" نئی عمر کے مشتاق بھائی نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔

بابو جی گاؤں کے پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے دسویں پاس کی تھی، ہندی کے ساتھ ساتھ اردو بھی جانتے تھے۔ وہ دور شہر میں چالیس برس نوکری کرنے کے بعد اب گاؤں میں رہنے لگے تھے۔ ان کے بیٹے بھی دلی میں اپنے اپنے پیروں پر کھڑے تھے۔ بابو جی ہر وقت گاؤں کی خدمت میں لگے رہتے۔ زمین کی پیمائش کا کام تو بابو جی کے علاوہ کوئی نہیں کر پاتا تھا۔ ادھر بابو جی نے انجکشن لگانا بھی سیکھ لیا تھا۔ اب وہ گاؤں کے بیماروں کے انجکشن بھی لگا دیا کرتے تھے۔ لڑائی جھگڑوں کے فیصلے کے لئے گاؤں والے بابو جی کے پاس ہی جاتے۔ سب ان کے فیصلے کا احترام کرتے تھے۔ وہ بہت دور رس تھے۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ دراصل نئی نسل کے ذہنوں کو سیاسی جماعت والے جلدی متاثر کر لیتے ہیں۔ ویسے تو گاؤں میں ماحول ٹھیک ہی تھا لیکن مستقبل کا کیا پتہ۔ بابو جی نے حکمت سے گاؤں کے ہندوؤں کو بھی قبرستان کی چار دیواری کے لئے تیار کر لیا تھا۔ بلکہ ان میں سے کئی تو اس کام کے لئے ہر وقت بابو جی کے ساتھ تھے۔ انہوں نے

قبرستان کا استعمال کرنے والے ناراض ہندوؤں کو بھی قبرستان خالی کرنے کے لئے راضی کرلیا تھا۔ لیکن معاملہ اس وقت بہت نازک ہوگیا تھا جب قبرستان کا ذاتی استعمال کرنے والے کچھ مسلمانوں نے قبرستان خالی کرنے سے بالکل انکار کردیا تھا۔

''باؤجی۔۔۔۔ کچھ بھی ہوجائے ہم چاردواری نہ بنن دن گے۔'' عزیز بھائی نے بابوجی سے انتہائی غصہ کی حالت میں کہا۔

''ہم اپنے جانور کہاں باندھین گے؟ کوڑی کہاں ڈلے گی؟ ناج کہاں نکلے گو؟''

''ہاں ہاں عزیز بھائی۔ میں بھی تمہارے سنگ ہوں۔'' الیاس بیچ میں ہی بول پڑا۔

پھر تو کئی آوازیں ایک ساتھ مخالفت میں بلند ہونے لگی تھیں۔ بابوجی کو اپنی محنت پر پانی پھرتا دکھائی دیا۔ انہوں نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

''بھئی دیکھو۔ یہ کوئی میرا ذاتی کام تو نہیں۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔ خود سوچو ہم برسوں سے قبرستان کی بے حرمتی کرتے آرہے ہیں۔ یہاں ہمارے بزرگ دفن ہیں اور ہم قبروں پر نہ صرف چلتے پھرتے ہیں بلکہ جانور گندگی بھی کرتے ہیں۔ موت تو برحق ہے۔ سب کو آنی ہے۔ قبرستان نہیں رہے گا تو دفن کے لئے کہاں جاؤ گے؟ شمشان گھاٹ کے بغیر مردے سڑک پر جلائے جاسکتے ہیں لیکن قبرستان کے بغیر۔۔۔۔۔۔؟''

آواز رک گئی تھی۔ خاموشی۔۔۔۔۔۔ ہر طرف خاموشی۔

سناٹا طویل ہوتا گیا تھا۔ اس سے قبل کہ چہ مے گوئیاں شروع ہوتیں، قصہ گو کی آواز پھر بلند ہوئی۔

''داستان درمیان میں روکنے کا بھی ایک سبب ہے۔

میں کئی صدی سے اس گاؤں میں آباد ہوں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پہلے لوگ میرے نام سے ہی ڈرتے تھے۔ میرے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ ویرانی، وحشت، خاموشی، تنہائی، سناٹے میرے گہرے دوست ہوا کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ بہت خوش

تھا۔ کوئی قبر کھودی جاتی تو مجھے مسرت کا احساس ہوتا۔ جنازہ لئے جب لوگ میرے دامن میں آتے، مجھے خوشی ہوتی، ہر طرف سے لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے کلمات بلند ہوتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے گئے۔ گاؤں میں امبیا کی طرح جب خاندان بڑھنے لگے تو مکانات، قدموں قدموں، چلتے گاؤں کے باہر بھی نکل آئے تھے۔ میرے آس پاس بھی گھر آباد ہونے لگے۔ ہندو اور مسلم دونوں نے اپنی زندگی آمیز حرکات وسکنات سے میرے احباب ویرانی، وحشت، خاموشی، تنہائی اور سناٹے کو یکے بعد دیگرے اپنی موت آپ مرنے پر مجبور کردیا تھا۔ لوگوں نے میرے اوپر سے راستے بنالیے۔ اپلے بونگے، بٹورے، کوڑی بنانا اور دوسرے کام شروع کردئے۔ جانور باندھے جانے لگے۔ کھیت سے فصل کٹتی اور میرے اوپر کھلیان بنائے جاتے۔ حتیٰ کہ شادی بیاہ میں بھی میرا استعمال ہونے لگا۔ میں کیا کرتا؟ کس سے شکایت کرتا؟ ان سب کے باوجود مجھے سب سے اچھا گاؤں کا اتفاق واتحاد لگتا تھا۔ میں اپنی بے عزتی بے حرمتی اور پامالی پر خون کے گھونٹ پی کر بھی سوچتا رہ جاتا کہ خدا انہیں کبھی تو عقل وفہم دے گا اور انہیں کبھی تو میرا خیال آئے گا۔

سنو! ذرا غور سے سنو!

میری داستان میں اب عروج آنے والا ہے۔

''ہمیں کچھ نہ پتو، جب مرن گے جب دیکھن گے۔''

عزیز بھائی اپنے موقف پر اٹل تھے۔ بابوجی کے سمجھانے سے بہت سے مخالفین مان گئے تھے لیکن دیوار کے سلسلہ میں کوئی چندہ یا مدد دینے سے انکار کردیا تھا۔ بابوجی نے گاؤں اور شہروں سے چندہ جمع کرکے اینٹیں منگوالی تھیں۔ سیمنٹ بھی آگیا تھا۔ پوری تیاریاں ہونے کے بعد چہار دیواری کے لئے جمعہ کا دن منتخب ہوا تھا۔ گاؤں کے سمجھ دار قسم کے ہندو بھی بابوجی کے ساتھ تھے۔

''باؤجی آپ فکر نہ کرو۔ کام جوڑو۔ پھر دیکھن گے کس میں کتنو دم ہے۔''

''چار دیواری کا کام دکھن کی طرف سے شروع ہو گیا تھا۔ جہاں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا۔لیکن گاؤں میں آہستہ آہستہ افواہیں گرم تھیں کہ عزیز بھائی اور ان کے بیٹے بلم اور کٹے وغیرہ کا انتظام کر رہے ہیں،ان کے گھر کے سامنے خون خرابہ ہو سکتا ہے۔

بابو جی اور عزیز بھائی ایک ہی خاندان کے افراد تھے۔ دو بھائیوں کی اولادیں تھیں۔ بڑے بھائی کے پانچ اور چھوٹے کے تین بیٹے تھے۔ بڑے بھائی کے پانچوں بیٹوں کے بیٹے، پوتے، پوتیاں تقریباً پچاس لوگوں کا کنبہ تھا جو قبرستان کی مخالفت پر آمادہ عزیز بھائی کا طرف دار ہو سکتا تھا۔ سب ایک ہی تھے۔ ایک ساتھ کھاتے پیتے۔ کام کرتے۔ بڑا سا آنگن تھا جس کے چاروں طرف مکانات تھے۔ ہر کام ایک ساتھ۔ دانت کاٹی روٹی، ایک اپنے گھر کھانا کھاتا تو بابو جی کے یہاں پانی پیتا۔ رشتہ داریوں میں جاتے تو بابو جی خود بڑھ کر سب کا کرایہ ادا کرتے۔ کوئی معاملہ الجھ جاتا تو بابو جی منٹوں میں سلجھا دیتے۔ دور دور تک لوگ بابو جی کو احترام کی نظر سے دیکھتے۔ بابو جی کہہ کر پکارتے۔

ایک بار کا ذکر ہے۔ قبرستان اور ڈگڑے کے بیچ میں ایک کنویاں تھی۔ چھوٹی سی کوئیاں۔ بیس بائیس فٹ گہری اور چار فٹ گولائی والی۔ کوئیاں کی صفائی چل رہی تھی کہ اچانک بابا صدیق کا بڑا بیٹا اختر نجانے کیسے کوئیاں میں گر پڑا۔ پاس ہی بابو جی کھڑے تھے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ خود کوئیاں میں چھلانگ لگا دی اور اس سے قبل کہ کوئیاں کا پانی بچے کو نقصان پہنچاتا، بابو جی نے بچے کو بچا لیا۔ بعد میں اوپر سے ٹوکرا رسی سے باندھ کر لٹکایا گیا اور بچے کو صحیح سلامت نکالا گیا۔ سب نے بابو جی کی بہت تعریف کی تھی۔ ایسے سینکڑوں معاملات و واقعات تھے جب بابو جی نے اپنی عزت داؤ پر لگا کر گاؤں کی عزت بچائی تھی۔ بڑے بابا کے بچوں کا بٹوارہ ہوا تو بابا صدیق کو انھوں نے زمین جائیداد سے الگ کر دیا تھا۔ اس وقت بابا صدیق گاؤں چھوڑ کر جانے کو تیار تھے۔

''میں تو گاؤں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

بابا صدیق کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسمٰعیل بابا نے بہت سمجھایا تھا۔ لیکن وہ کسی

قیمت پر رکنے کو تیار نہ تھے۔ ایسے میں بابو جی نے اپنی قربانی دے کر معاملے کو سنبھالا تھا۔

''صدیق بھائی تم گاؤں نہیں چھوڑو گے۔ زمین کی ہی بات ہے نا۔ لو میرے حصے کی اس زمین میں گھر بنا لو۔'' اور انہوں نے اپنے حصے کی زمین پر بابا صدیق کا گھر بنوا دیا تھا۔

قبرستان کی چار دیواری کے معاملے کو تین سال ہو گئے تھے۔ پتھر کی سلوں کی طرح مضبوط و مستحکم دلوں میں شگاف پڑ گئے تھے۔ ذاتی مفاد، تعلقات کی زمین کھود رہے تھے۔ لیکن کہتے ہیں نا ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔ عزیز بھائی کو لاکھ سمجھایا گیا لیکن وہ نہیں مانے۔

''نا میں نا جن دن گو......''

گاؤں کے غیر مسلم بزرگوں اور نوجوانوں نے عزیز بھائی کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور مزدوروں نے جلدی جلدی دیوار چن دی تھی۔ کچھ دیر بعد عزیز بھائی نے بھی ہارے ہوئے جواری کی طرح سپر ڈال دی تھی۔ انہیں اپنی شکست کا اتنا زبردست صدمہ پہنچا تھا کہ انہوں نے چارپائی پکڑ لی تھی اور کچھ دن بعد چارپائی نے ڈولے کی شکل اختیار کر لی۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں اپنے کھیت کے ایک کونے میں دفنایا گیا۔ آپسی محبتیں نفرتوں، بغض و عداوت اور دشمنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ بدلتا چلا گیا۔ چہار دیواری کرانے والے بزرگ اللہ کے یہاں چلے گئے تھے اور ان کی اولادیں زیادہ تر شہروں میں جا بسی تھیں۔ اُدھر عزیز بھائی کے کھیت کا کونا وسیع ہوتا گیا......اور......

آواز بند ہو گئی تھی......

خاموشی نے مارشل لا لگا دیا تھا۔

اچانک کسی کے سسکنے کی آواز بلند ہوئی۔

میں......میں......پھر ویران ہو گیا ہوں۔

اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ کوئی میرے آنسو پونچھنے والا بھی نہیں۔

جنازے میرے پاس سے گزر کر کھیتوں والے علاقے کو آباد کرتے ہیں میرے

دامن کی قبریں اپنا ظاہری وجود بھی کھو چکی ہیں۔ چار دیواری کی اینٹیں لوگ حسب ضرورت اپنے گھروں میں لے جا چکے ہیں۔ میں ایک چٹیل میدان ہو گیا ہوں۔ کبھی کبھار بچے کرکٹ کھیلنے آجاتے ہیں۔ میری شناخت ختم ہو گئی ہے۔ شاید یہ میرا آخری وقت ہے۔ ہر شئے کو موت آتی ہے۔ لیکن شاید مجھے آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ وقت ابھی پورا نہیں ہوا ہے مجھے انتظار ہے، خاندان کے اس وسیع عریض آنگن والے مکان میں اٹھنے والی دیواروں کی طرح اپنے قریے اور خطے میں اگنے والی دیواروں کا۔ جب مجھے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے بلند و بالا عمارتوں کی آماجگاہ بنا دیا جائے گا۔ وہ شاید میری داستان کا آخری صفحہ ہو۔

مرکزی حکومت کے منصوبے کے مطابق این سی آر میں آس پاس کے علاقے کو شامل کرتے ہی خالی پڑی زمینوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ صدیوں سے مردہ پڑی دھنورا قبرستان کی زمین، آس پاس کی زمینوں کے ساتھ ایک بڑے Power Plant کے لئے منتخب کی جا چکی تھی۔ اندھیرے دن کے اجالے میں ضم ہو کر رات کی کوکھ سے نئی روشنی کی شکل میں نمودار ہو رہے تھے۔

☆☆

بنتے مٹتے دائرے

وہ خصوصی طور پر آسمان سے نہیں اتری تھی۔ اسی گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی اور اب گاؤں کی پہچان بنی ہوئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جس نے ظلم سہا اور آہستہ آہستہ خود کو ظلم کے خلاف کھڑا بھی کیا۔۔۔ وہ عام سی لڑکی تھی۔

وہ، ماتا دین اور شربتی کی اکلوتی اولاد تھی۔ بچپن ہی سے وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن نین نقش ایسے کہ چہرے پر کشش اور بھولپن ہمیشہ طاری رہتا۔ دس بارہ سال کی عمر تک تو وہ توتلی بھی تھی۔ زیادہ تر لوگ اسے سننے کے لیے بے سبب بھی چھیڑتے۔

''کہاں والی ہے لڑکی؟'' گاؤں کے چاچا البشر نے اسے چھیڑا۔

''کہیں نا دالی، بت'' اس کے جواب پر لوگ ہنس پڑے۔

''اَلے کو دانت پھار لیے ہو؟'' وہ تھوڑا طیش میں آگئی۔

البشر چاچا، رامو، جوگندر، موہن سب مزید ہنسنے لگے۔

''میں تمہاری چھکایت کراوں گی۔ بابا چھے'' وہ ان کی ہنسی سے تنگ آتے ہوئے بولی۔

''دا بول دے، بابا چھو......'' رامو اس کی نقل کرتے ہوئے بولا تو سب ایک بار پھر ہنس پڑے۔ اتنے میں ماتا دین وہاں آ گیا۔ ماتا دین بھنگی تھا۔ اسے ویسے بھی گاؤں کے

لوگ بہت کمتر سمجھتے تھے۔ اکثر تو اس سے دور دور ہی رہتے۔ ماتا دین بڑا محنتی اور ایماندار تھا۔ وہ گاؤں کے گھروں میں کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی شربتی بھی گاؤں میں کام کیا کرتی تھی۔ دونوں نے اپنی بیٹی کو بڑے جتن سے پالا تھا۔ وہ دونوں اپنی بیٹی کو، اپنے کام سے دور رکھنا چاہتے تھے اور اسے پڑھانا بھی چاہتے تھے۔ بڑی منت سماجت کے بعد انہوں نے اپنی بیٹی کا نام گاؤں کے اسکول میں لکھوا دیا تھا۔ آشا، ہاں یہی نام تھا اس کا۔ آشا اسکول جانے لگی تھی۔ عمر میں تو وہ سات آٹھ سال کی ہوگی جب اسے اسکول میں بٹھایا گیا۔ اپنی کلاس میں وہ سب سے بڑی تھی۔

''بابا...... دیکھو۔ یہ سب مدے تنگ کر لے ہیں۔'' آشا نے ماتا دین کو دیکھ کر آواز لگائی۔ ماتا دین نے چاچا البشر اور دوسرے لڑکوں سے نرمی سے کہا۔

''اسے تنگ نہ کرو، جاؤ اپنا کام کرو۔''

اور سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ آشا محنت کرنا جانتی تھی۔ اسکول میں بھی وہ خوب دل لگا کر پڑھتی۔ لیکن دوسرے بچے اسے دھتکارتے رہتے۔ کبھی کبھی تو استاد بھی اس کے خلاف ہو جاتے۔

''مسل، دیکھو، یہ مندو (منجو) مجھے تنگ کل لئی ہے۔''

اس نے منجو نامی اپنی کلاس میٹ کی شکایت ٹیچر سے کی۔ منجو گاؤں کے مکھیا کی بیٹی تھی۔ مکھیا کا گاؤں پر راج تھا۔ اس کے دو بٹے کٹے بیٹے تھے، پھر چار پانچ مشٹنڈے بھی ہر وقت بیٹھک پر پہرہ دیتے رہتے تھے۔ مکھیا گری راج برہمن تھا اور اس کے پاس قریب ۱۰۰ بیگھے زمین تھی۔ اتنی زمین تو گاؤں کے اور بھی کئی لوگوں کے پاس تھی، مگر گری راج دبنگ قسم کا آدمی تھا۔ وہ کئی بار سے الیکشن جیت رہا تھا۔ گاؤں کے آدھے سے زیادہ لوگ اس کے ووٹر تھے۔ باقی ماندہ، غریب، مزدور اور کمین، اس کے رعب داب کے آگے آواز تک نہیں نکال سکتے تھے۔ ماتا دین تو بے چارہ غریب گاؤں کی گندگی صاف کرنے کا کام کرتا تھا۔ کام کے بدلے لوگ اسے اناج دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک چیز اور دیتے تھے نفرت، حقارت

اور پھٹکار، ماتا دین اور اس کی بیوی شربتی ایسی ہی بے عزتی، نفرت اور حقارت کے اپنے پیٹ میں بطور لقمے اتار اتار کر زندگی گذار رہے تھے، مکھیا تو اسے اکثر ذلیل کرتا رہتا تھا۔

''کیوں بے ماتا دین، دو دن سے صفائی کے لیے نہیں آیا۔ کہاں مر گیا تھا۔''

''سرکار، میں شربتی کے گاؤں چلا گیا تھا، کچھ کام تھا۔''

''بتایا کیوں نہیں۔ یہ کام کون کرے گا تیرا باپ۔''

''ہمیں کریں گے سرکار......''

اور وہ مکھیا کے گھر کے ٹائلٹ اور باتھ روم صاف کر کے ہی گھر واپس جاتا۔ گاؤں میں اب ترقی ہونے لگی تھی۔ گاؤں کی سڑکیں بھی اچھی ہو گئی تھیں، کھیتی بھی اب بیلوں کے بجائے ٹریکٹر اور دوسری مشینوں سے ہونے لگی تھی۔ گاؤں کے مکھیا اور اس جیسے امیر گھروں میں نیا فیشن آ گیا تھا۔ موٹر سائیکلیں، کاریں، کولر وغیرہ لگ گئے تھے۔ ٹائلٹ اور باتھ روم بن گئے تھے۔ اب دیر سویر مردوں، عورتوں کو جنگل جانا نہیں پڑتا تھا۔ لیکن گاؤں کی تقریباً نصف سے زیادہ آبادی آج بھی سو سال پیچھے ہی تھی۔ گاؤں میں ایک ہی اسکول تھا۔ اسکول کے لیے بھی گری راج ہی نے سرکار کو زمین دی تھی۔ اسکول کے ماسٹر بھی مکھیا کو سلامی مارتے تھے۔ مکھیا کی بیٹی منجو اور آشا ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ منجو کا اسکول میں سکہ چلتا تھا۔ وہ سب پر سواری کرتی تھی۔ ماسٹر بھی اسے کبھی کچھ نہیں کہتے۔ بچے بھی اس کی شکایت ماسٹر سے کرنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ وہ آشا کو اکثر چھیڑتی رہتی تھی۔ ایک بار آشا نے جب منجو کی شکایت ماسٹر سے کی تو منجو کو بہت غصہ آیا۔ اس ماسٹر کے سامنے ہی آشا کی چٹیا پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیا۔ آشا کو اس اچانک حملے کی امید نہیں تھی۔ وہ گر تو گئی پر اٹھتے ہی اس نے منجو کے بال پکڑ لیے۔ اس سے قبل کے منجو، آشا کے قابو میں آ جاتی، ماسٹر نے منجو کو بچا لیا اور آشا کو پکڑ لیا۔ آشا کے ماسٹر کی گرفت میں آتے ہی منجو نے آشا کو ایک زبردست گھونسہ رسید کر دیا۔ آشا کی ناک سے خون نکل آیا۔ ماسٹر نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے آشا کو ڈانٹا۔

''تم بے کار میں لڑنے لگتی ہو___''

''سل اس نے میلی ربر توڑ دی تھی اور یہ مجھے دھولتی رہتی ہے۔'' (اور یہ مجھے گھورتی رہتی ہے)

''مجھے منجو نے بتایا تم نے اسے گالی دی تھی۔''

''اب آئندہ اگر کسی سے بھی لڑیں خاص کر منجو سے تو تمہارا نام کاٹ دیا جائے گا۔

آشا ہکا بکا سی ماسٹر کو دیکھ رہی تھی۔ ایک تو اس کی غلطی نہیں تھی۔ دوسرے اسی کو مارا بھی گیا اور ماسٹر کی ڈانٹ بھی اسی کے حصے میں..... یہ سب کیا ہے؟ اسے پتہ نہیں تھا کہ سماج میں کیا ہو رہا ہے؟ کون بڑا ہے، کون چھوٹا؟ اس کے بابا اور ماتا کو گاؤں میں سب برا کیوں سمجھتے ہیں؟ آشا ان باتوں سے بے خبر تھی۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ مکھیا کیا ہوتا ہے؟ کیوں ہوتا ہے؟ پھر منجو کیوں اس کو ہمیشہ برا سمجھتی ہے۔ اس سے دور دور رہتی ہے۔

گھر آکر جب اس نے اپنی ماں سے سب کچھ بتایا تو شربتی نے اسے سمجھایا۔

''بیٹا تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

''وہ مدے مالتی ہے۔ میں بھی اُتھے مالوں گی۔''

''نہیں بیٹا، اس کے پاپا مکھیا ہیں۔ ان کے پاس طاقت ہے''

''میلے پاپا بھی تاکت ول ہیں۔ میں بھی تم نہیں ہوں۔ مجھ میں بھی تاکت ہے۔''

وہ بے چاری وہی سوچ رہی تھی اور کہہ رہی تھی، جو جانتی تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ طاقت کیا ہوتی ہے۔ گاؤں کا مکھیا یا پردھان کتنا طاقت ور ہوتا ہے۔ اسے علم ہی نہیں تھا۔ شربتی نے اپنی بیٹی کو لپٹا لیا اور بے تحاشہ پیار کرنے لگی۔ اس کے زخم کو اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔۔ شربتی بیٹی کو پیار کرتے کرتے ماضی کے آنگن میں جا کودی۔

گرمی کے دن تھے۔ دن میں لو چلتی تھی۔ راتیں بھی گرم تھیں۔ ایسے میں گیہوں کے کٹائی کے دن بھی آگئے۔ دن دن بھر تپتی دوپہر میں کھیت کاٹنا آسان کام نہ تھا۔ ماتا دین، اس کے بابا طوطا رام، شربتی اور ان کی اکلوتی بیٹی آشا۔ ماتا دین اور طوطا رام تو پو پھٹنے

سے پہلے ہی کھیتوں میں پہنچ جاتے اور کٹائی شروع کر دیتے۔ شربتی سورج نکلنے کے بعد گھر کا کام کاج نپٹانے اور دونوں کا کھانا تیار کر کے آشا کو گود میں لے کر شربتی کھیت پر جاتی تو اسے پیڑ کی چھاؤں میں بٹھا دیتی۔ وہ کھیلتی رہتی اور سب کھیت کاٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ مکھیا کے کھیت میں کام کرتے یہ ان کی تیسری پیڑھی تھی۔ بارہ مہینہ، تیسوں دن کام۔ کبھی کھیت کی جتائی تو کبھی بوائی___ کبھی سردی کی ٹھٹھرتی راتوں میں پانی لگانا، فصل کاٹنا، اناج نکالنا۔ کام تھا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اسی کام اور کھیت میں ماتا دین کے دادا، ان کے بھائی اور ماتا دین کے چاچا اور بابا نے عمریں کھپا دیں تھیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے مگر کام تھا کہ قابو میں ہی نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی ماتا دین سر پکڑ کر سوچا کرتا، بھگوان کا بھی کیا نیائے ہے۔ ہمیں نسل در نسل دوسروں کی غلامی اور مزدوری اور مکھیا کے خاندان کو نسلوں سے نوابی اور عیش ___ ہے بھگوان یہ کیا ہے؟ کیا ہم اور ہماری نسلیں اسی پرکار دوسروں کے گھر اور کھیت پر کام کرتے کرتے مٹی میں مل جائیں گے۔ کیا ہماری نسل میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہوگا۔

''ارے ماتا دین، کہاں کھو گیا۔ دیکھ تیری مانگ تو پیچھے رہ گئی۔''

اور ماتا دین سوچ کی بستی سے باہر آجاتا۔ جلدی جلدی اپنے حصے کی مانگ پوری کرتا۔ سر کا پسینہ خود راہ بناتے، پورے جسم کا سفر طے کرتے کرتے ٹانگوں تک پہنچ جاتا۔ سورج دیوتا کو ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے بادلوں میں منہ چھپا لے۔ ہمیشہ آگ برساتا رہتا۔ وہ اور شربتی تھوڑی دیر ستانے کے لیے پیڑ کے نیچے بچی کے پاس چلے گئے تھے۔ طوطا رام کام کرتے رہے۔۔ ماتا دین نے کمر سیدھی کرنے کو خود کو زمین سے ملا دیا تھا۔ پیڑ کی چھاؤں، ہلکی ہلکی پچھوا ہوا، ویسے تو ہوا گرم تھی لیکن پیڑ کے نیچے آرام پہنچا رہی تھی، ماتا دین کو نیند آگئی تھی۔

ماتا دین خواب کی حسین وادیوں میں تھا۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ اس کی بڑی سی بیٹھک پر مجمع لگا ہے۔ گاؤں کے امیر اور رئیس بیٹھے ہیں۔ گری راج بھی ایک کونے میں بیٹھا ہے۔ ماتا دین نے گری راج کو پکارا۔

''گری راج ___ وہاں کیوں بیٹھا ہے۔ ادھر آؤ۔''

''جی سرکار.......''

گری راج کے پاس آنے پر ماتادین نے اپنا داہنا پاؤں اس کے کندھے پر لٹکا دیا۔

''لے داب.........''

اور گری راج پاؤں دابنے لگا تھا۔

''اور گری......کل سے تم گھر کا کام بھی سنبھال لو۔ میری مالش کا کام تم خود کرو گے۔ اپنے بیٹوں کو بھی لگا لینا۔''

''جی حضور......''

اچانک ایک زور کی آواز ہوئی۔ ماتادین درد سے بلبلاتا ہوا جاگ پڑا تھا۔ مکھیا کے آدمی ادھر آگئے تھے اور ان میں سے ایک نے اس کے بہت زور کی لات ماری تھی۔

''کیوں بے حرام خور، کام چھوڑ کے مزے سے سو رہا ہے۔''

بے چارہ درد سے کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''حرام کی توڑتا ہے اور اپنی لوگائی کو بھی آرام کراتا ہے۔''

''معاپھ کر دو۔ جرا سی آنکھ لگ گئی تھی۔'' ماتادین گڑگڑایا۔

اس سے قبل کے مکھیا کے دوسرے آدمی کی لات ماتادین کے جسم کو چاٹتی، شربتی بیچ میں آگئی اور گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

''ہجور گلطی ہو گئی۔ ہم ابھی کام پر جا رہے ہیں۔''

اور شربتی نے جلدی سے آشا کو اٹھایا، ماتادین کا ہاتھ پکڑا اور چلچلاتی دھوپ میں بابا طوطارام کی طرف چل پڑی۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ماتادین سے پہلے طوطارام اور ان کے پتا جی بھی اسی طرح کی زندگی گذار چکے تھے۔ ہر وقت کام ہی کام۔ کام کے بدلے بس، باسی اور بچا کھچا، کھانا ___ لیکن محنت کے بعد تو یہ کھانا بھی ایسا ہی لگتا جیسے من و سلویٰ ہو۔ ایسے ہی بے شرمی کے نوالے تہہ در تہہ اپنے پیٹوں میں اتار کر ماتادین کی پوری نسل پہلے

جوان، پھر بوڑھی اور پھر اپنی انتم یاترا تک پہنچی تھی۔

''ماں، او ماں..........تھاتا دونا، بھوت لدی ہے۔''

آشا کے جملوں نے شربتی کو ماضی کے آنگن سے نکال کر حال کے کمرے میں لا دیا۔ آج جب اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تو اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ اسے بھگوان پر بھی غصہ آیا۔

ہے بھگوان تو نے ہمیں، اتنا چھوٹا کیوں بنایا۔ ہمیں بھی برہمن بناتا۔ دنیا ہمیں بھنگی کہتی ہے۔ زبردستی کام کرواتی ہے۔ مزدوری بھی پوری نہیں دیتے۔ اوپر سے نفرت کرتے ہیں۔ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ہے بھگوان کیا ہمارا خون اور ان کا خون الگ ہے۔ کیا ہماری کاٹھی اور ان کی کاٹھی میں فرق ہے۔ ہے بھگوان میں نے بہت سہہ لیا۔ تو نے نیچ ذات میں پیدا کیا، میں کچھ نہیں بولی۔ تو نے ماتادین سے بیاہ دیا، جس کے گھر کوئی سکھ نہیں ملا، میں کچھ نہیں بولی۔ اپنی نظروں سے پتی کو جوتوں سے پٹتے دیکھا، میں کچھ نہیں بولی۔ لیکن آج میری بیٹی کو مارا گیا ہے۔ اب حد ہو گئی ہے اب میں بولوں گی۔ میں اپنی بیٹی کی بے عزتی نہیں سہہ سکتی۔ میں اپنی بیٹی کو غلام نہیں بننے دوں گی۔ اسے پڑھاؤں گی، لکھاؤں گی۔ یہ پڑھ لکھ کر بڑی بنے گی۔ کسی کے گھر بے کار نہیں کرے گی۔ ایک دن لوگ میری بیٹی کے آگے پیچھے گھومیں گے۔

آشا کی دوبارہ آواز پر وہ واپس ہوئی اور اسے کھانے کو دیا۔

اگلے دن شربتی، آشا کو چھوڑنے اسکول گئی تو ماسٹر سے الجھ گئی۔

''ماسٹر صاحب! کل آپ نے میری بیٹی کو پٹوایا۔''

''ارے شربتی، تجھے پتہ ہے تو کیا بول رہی ہے۔ مکھیا کی بیٹی ہے وہ۔''

''ہاں! ہاں! مجھے پتہ ہے پر میری بیٹی کا کوئی کسور ہو تب نا ___''

شربتی اپنا احتجاج درج کرا کے جا چکی تھی۔ اسے وہ دن بھی یاد آ رہا تھا جب اس نے آشا کے داخلے کے لیے ماسٹر سے بات کی تھی۔ پہلے تو ماسٹر نے منع ہی کر دیا تھا۔ پھر

جب اس نے ماسٹر کی خوشامد کی تو وہ تیار ہوا۔ لیکن مکھیا سے پوچھنے کے بعد داخلہ لینے کی بات کی اور ایک دن جب مکھیا اسکول میں آئے تو ماسٹر نے آشا کے داخلے کی بات رکھی۔

''ہا۔ہا... بھئی واہ۔اب یہ بھی پڑھیں گے۔چلو یہ بھی کرلو۔ماسٹر کرلو بھئی داخلہ۔ پڑھ کر کیا کریں گے۔ہم بھی دیکھیں گے۔کرنا تو ہماری غلامی ہی ہے......''

مکھیا کے لہجے میں تمسخر اور حقارت تھی۔

شربتی کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔وہ تو آشا کا داخلہ چاہتی تھی بس۔شروع شروع تو آشا کو اسکول میں بڑی پریشانی ہوئی۔ایک تو اس کا توتلہ لہجہ، دوسرے سب کچھ نیا نیا۔پھر کچھ دنوں بعد آشا کا دل پڑھائی میں لگنے لگا تھا۔

وقت گذرتا گیا۔چار پانچ سال کیسے ہوا ہوئے، پتہ نہیں چلا۔اب آشا جوانی کی دلیز پر پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی تھی۔اس کا رنگ سانولا ضرور تھا مگر چہرے کی ساخت غضب کی تھی۔آنکھیں بڑی حسین تھیں۔ایک کشش تھی اس کی آنکھوں میں گویا کوئی مقناطیسی قوت بھری ہو۔قد بھی اچھا تھا۔کھلے بال جب ہوا کے دوش پر لہراتے تو نہ جانے کتنے دلوں پر بجلی گرتی۔گاؤں میں آشا کے چرچے ہونے لگے تھے۔گاؤں کے آوارہ لڑکے اسے دیکھ کر آہیں بھرتے۔لیکن مجال ہے کسی کی جو اس سے کچھ کہہ دے۔آشا مضبوط قوت ارادی کی لڑکی تھی۔وہ ہمیشہ ظلم کے خلاف لڑنے کو تیار ہو جاتی تھی۔بچپن سے جوانی تک بہت سے واقعات تھے جب آشا نے دوسروں کی مدد کی۔لڑکیوں کو لڑکوں سے بچانا اور دبے کچلوں کی مدد کرنا، اس کا شوق تھا۔وہ کبھی کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔ایک بار وہ اسکول سے لوٹ رہی تھی۔اس نے دیکھا راستے میں گاؤں کے دو آوارہ لڑکے، اس کی چچازاد بہن مینا کو پریشان کر رہے تھے۔آشا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ ان لڑکوں میں سے ایک سے بھڑ گئی۔ اس نے اس پر گھونسوں کی بارش کردی۔دوسرا لڑکا بھیڑ جمع ہوتے دیکھ رفو چکر ہو لیا تھا۔

شربتی کو بیٹی کی جوانی سے خوف آنے لگا تھا۔وہ جانتی تھی زمانہ کتنا خراب ہے۔ دوسرے نچلے ذات کی عورتوں اور لڑکیوں کو تو لوگ مال مفت سمجھتے ہیں۔اسے اپنی جوانی یاد

آگئی تھی۔جب وہ جوانی کی دلیز پر تھی تو اس کے گاؤں کے پردھان کے بیٹے کی نظر اس پر پڑی تھی۔بس پھر کیا تھا۔وہ ہر وقت اس کے پیچھے پیچھے رہا کرتا۔شربتی، پردھان کے گھر کام کاج کے لیے جاتی تھی۔اپنا بہت خیال رکھتی لیکن طاقت کے آگے سب بے سود ہوتا ہے۔ پردھان کے بیٹے نے ایک دن اس کا منہ دبا کر اپنے کمرے میں بند کرلیا۔وہ روتی رہی اور اس کی قسمت اس پر ہنستی رہی۔طاقت کے نشے نے اس کے چپے چپے پر تباہی مچائی تھی۔ اسے تو کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ہوش آنے پر وہ بے سدھ سی پڑی تھی۔پردھان کا لڑکا سامنے تھا۔اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

''کسی سے کہا تو تجھے اور تیرے خاندان کو خاک میں ملا دوں گا۔''

اور شربتی نے اس معاملے کو اپنے گناہ کی طرح چھپا لیا تھا۔اسے پتہ تھا پردھان اور اس کے بیٹے کتنے طاقت ور ہیں۔کچھ مہینوں بعد اس کی شادی ماتا دین سے ہوئی تو وہ مرینا گاؤں سے فراد پورا آگئی تھی۔غریبی، بے بسی اور بے غیرتی اس سے چپٹی یوں چلی آئی تھیں گویا وہ اس کے جہیز کا حصہ ہوں۔ماتا دین کے گھر کے لوگ بھی مزدور پیشہ تھے اور مکھیا گری راج کے یہاں کام کرتے تھے۔شادی کے کچھ دن بعد ہی شربتی کو بھی مکھیا کے گھر کام کاج کے لیے جانا پڑا تھا۔نیا ہمیشہ نیا ہوتا ہے، وہ بھی نئی نویلی دلہن ہی تو تھی۔اس پر بھی دلکشی سوار تھی۔جوبن پھوٹا پڑ رہا تھا۔مکھیا نے اسے ایک بار دیکھا، تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ماتا دین تیری جورو تو بڑی شاندار لگے ہے۔تو نے بتایا نہیں تیرا ووا کب ہوا؟

ماتا دین شرماتا ہوا اپنے اندر سمایا جا رہا تھا

''جی سرکار، بس پچھلے ہفتے ہی تو ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے آج رات اسے یہیں چھوڑ دو۔مالکن کی خدمت کے لیے۔''

ماتا دین نے تو روبوٹ کی طرح ہر حکم پر سر ہلانا سیکھا تھا۔کیا کرتا۔شربتی اسے التجا بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔مگر سب بے سود تھا۔

اور وہ رات مالکن کے بجائے، اسے مالک کی خدمت کرنی پڑی۔غم، غصہ اور

جنون اس کے اندر ابال مار رہا تھا۔ پر کیا کرتی۔ بڑے لوگوں سے ٹکرانا، خود ریزہ ریزہ ہو جانا ہے۔ یہ تو دنیا میں نہ جانے کب سے چلے آ رہے سلسلے میں غریب بے چارہ مجبور و بے کس ہوتا ہے۔ صحیح کہا ہے کہ غریب کی جورو سب کی جورو ہوتی ہے۔ اگلے دن جب وہ گھر پہنچی تو ماتادین نے پوچھا۔

''مالکن کی کھدمت کی نا تم نے۔''

''ہاں مالک نے خوب کھدمت لی ہے۔''

بے چارہ ماتادین سمجھتے ہوئے بھی نا سمجھ بن گیا تھا کہ یہی چارہ تھا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ مالک کی خدمت کیا ہوتی ہے۔ مالکن کی خدمت تو بہانا ہوتا ہے۔ مکھیا اس سے قبل بھی اس کی برادری کی بہوؤں اور بیٹیوں سے خدمت لے چکا تھا۔ ماتادین کے دل میں کبھی کبھی بہت جوش آتا۔ غصے کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ جی چاہتا مکھیا کے کئی ہزار ٹکڑے کر دے اور باہر میدان میں چیل کوؤں کے آگے ڈال دے۔

وقت دبے قدموں پرواز کرتا رہا۔ شربتی ایک بچی کی ماں بنی۔ بچی کا نام آشا رکھا۔ آشا تھی تو سانولی لیکن چہرہ بہت دلکش تھا۔ آشا، ماتادین، بابا طوطارام اور شربتی کے کاندھوں، کاندھوں بڑی ہوتی گئی۔ شروع شروع میں تتلاہٹ نے کافی پریشان کیا بعد میں وہ بھی غائب ہوگئی۔

....

آشا جب سولہ سال کی ہوئی تو اس کی جوانی کے چرچے گاؤں میں پھیل گئے تھے۔ اس نے دسویں کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ پر اب آگے کی پڑھائی کی بات تھی۔ آشا چاہتی تھی آگے پڑھے۔ لیکن ماتادین اس کا بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی دوران یہ ہوا کہ گاؤں کے پنڈت مدن کا لڑکا چندر موہن اس کی طرف بڑھنے لگا۔ آشا کا دل بھی چندر موہن کے لیے دھڑکنے لگا۔ دونوں اسکول، گھر، کھیت، کھلیان میں چھپے چوری ملنے لگے۔

''آشا۔''

''ہوں۔''

''تم بہت خوبصورت ہو۔''

''جھوٹے...... ''مجھے پتہ ہے میں کتنی خوبصورت ہوں۔'' آشا چندر موہن کو الٹا سا جواب دیتی۔

''آشا، خوبصورتی صرف رنگ کی نہیں ہوتی۔ خوبصورتی من کی ہوتی ہے۔ پھر رنگ ہے ہی کیا، اصل تو نین نقش ہوتے ہیں، بناوٹ ہوتی ہے، روپ ہوتا ہے اور اس میں تم لاجواب ہو۔ پھر تمہارا نام، لاکھوں کروڑوں میں ایک ہے۔'' چندر موہن حسن کے دریا کو عبور کر رہا تھا۔

''اچھا۔ کیا ہے میرے نام میں۔'' آشا مزے لیتی ہوئی بولی۔

''آشا۔ یعنی امید، بھروسہ، قرار۔ ایک ایسی امید تمہارے نام میں چھپی ہے کہ ناامیدیں رفو چکر ہو جاتی ہیں۔ جگ کی آشا ہو تم۔ نراشا کے اندھیارے میں ایک کرن ہو تم، ایک روشنی ہو، نراش لوگوں کے لیے۔ جہاں ناکامی اپنے جھنڈے گاڑ دیتی ہے، جہاں کوئی راستہ نظر نہیں آتا وہاں تم ایک روشنی بن کر آتی ہو۔ تم سنسار کی ناکامی، نامرادی، مایوسی، ناامیدی اور کم ہمتی کے لیے راستہ بن جاتی ہو۔ آشا یعنی نراشا کے ایک یگ کا خاتمہ۔ آشا یعنی نئے یگ کی شروعات۔

''اچھا بابا بس کرو...... تم تو کویتا لکھنے لگے۔''

اور پھر دو بے چین روحیں، فاصلے برداشت نہ کر سکیں۔ ان کے پس و حال سے موسم تبدیل ہو گیا، ہوا مہک گئی۔ چرند پرند مست ہو کر جھومنے لگے۔

....

مکھیا کی بیٹھک پر مجمع لگا تھا۔ ایک تازہ مسئلہ زیر بحث تھا۔

''مکھیا جی۔ ماتادین کی لڑکی اور پنڈت مدن کے لڑکے میں جبردست اشک چل

رہا ہے" گاؤں کے ایک ادھیڑ کنور سین نے بتایا۔

"اوہ! یہ تو بڑی اچھی بات ہے......لونڈیا کے پر نکل آئے ہیں۔"

"سرکار دونوں اکثر ادھر ادھر دکھائی دیتے ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے رہتے ہیں۔"

"جاؤ ماتا دین کو بلا لاؤ......" مکھیا کے حکم پر اس کے مشٹنڈوں میں سے ایک، ماتا دین کے گھر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں ماتا دین ہاتھ جوڑے حاضر تھا۔

"ہاں بھئی ماتا دین، ہم کیا سن رہے ہیں، تیری لونڈیا پنڈت کے لڑکے سے عشق لڑا رہی ہے۔"

"سرکار ہم بجھا دیں گے اسے......"

"ہاں اسے سمجھا دے......ورنہ تو ہمیں جانتا ہے۔"

"جی سرکار......"

ماتا دین نے گھر آ کر شربتی کو سب کچھ بتایا۔ شربتی دونوں کے معاملات سے واقف تھی۔ اسے چندر موہن اچھا لگتا تھا۔ لیکن وہ معاملے کے انجام سے بھی ڈرتی تھی۔ اس نے کئی بار آشا کو سمجھایا تھا۔

"آشا۔ بیٹا تمہارا یہ خواب پورا نہیں ہو پائے گا۔ ایسے خواب مت دیکھو۔"

"ماں، چندر موہن کچھ دن بعد باہر پڑھنے چلا جائے گا۔ میں بھی چلی جاؤں گی۔ پھر ہر خواب پورا ہوگا۔" آشا کے حوصلوں کے آگے شربتی جھک جاتی تھی۔ وہ چندر موہن سے بھی بات کر چکی تھی۔ چندر موہن اٹل تھا۔ وہ تو سماج سے لڑ جانے کو بھی تیار تھا۔ شربتی نے مکھیا والی بات بھی دونوں کو بتا دی تھی۔ دونوں نے جلد ہی گاؤں چھوڑنے اور شہر جا کر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

....

ایک دن شام کا وقت تھا۔ آشا اور چندر موہن گاؤں کے باہر کھیت میں گھوم گھوم

کر باتیں کر رہے تھے۔ مکا، جوار اور باجرے کے کھیت اب بھرے بھرے لگنے لگے تھے۔ پورے علاقے میں ایک خوشبو سی پھیلی ہوئی تھی۔ موسم سہانا تھا۔ گرمی رخصت ہو رہی تھی اور برسات کی آمد آمد تھی۔ دو ایک بار بارش ہو چکی تھی۔ آسمان پر بادل کے چھوٹے موٹے ٹکڑے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ چاند آہستہ آہستہ روشن ہو رہا تھا، چندر موہن آشا کے پاس تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا گویا چندر موہن چاند ہے اور وہ چاندنی اور چندر موہن سے نکلتے ہوئے وہ سنسار پر چھائی ہوئی ہے۔ سب کو دودھیا کر رہی ہے۔ وہ چندر موہن کو پا کر خوش تھی۔ اس کی اندھیری زندگی میں چندر نے جو چاندنی پھیلائی تھی، وہ اسے منور اور مخمور کیے ہوئے تھی۔ ڈھلتی سہانی شام کا مدھم ہوتا اجالا رات سے گلے ملنے کو بے تاب تھا۔ پرندے اپنے ٹھکانوں کی جانب لوٹ چکے تھے۔ ہوا بھی رکی رکی سی تھی۔ کھیتوں پر خاموشی کی ایک چادر سی بچھی تھی۔ گاؤں کے راستے پر اکا دکا بیل گاڑی اور کسان آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ چندر موہن آج زیادہ ہی رومانی ہو رہا تھا۔ آشا آؤ، اپنے چاند میں سما جاؤ اور آشا نے نہیں چاندنی نے، خود کو چاند میں سمو دیا تھا۔ ابھی کوئی پل ہی گذرا ہوگا کہ اچانک منظر بدل گیا۔ ایک برق رفتار گاڑی وہاں آ کر رکی۔ بریک کی آواز نے سناٹے کے تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ گاڑی میں سے چار پانچ ہٹے کٹے غنڈہ نما لڑکے اترے اور عجیب تیوروں سے دونوں کی جانب بڑھنے لگے۔ چندر موہن اور آشا کی زندگی پر اچانک کثیف بادلوں کے سائے لہرانے لگے۔ دونوں نے خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ لوگ قریب آئے تو پتہ چلا ان میں دو مکھیا کے بیٹے اور باقی ان کے ساتھی تھے۔ دونوں خطرہ بھانپتے ہوئے ایک طرف کو بھاگنے لگے لیکن وہ کہتے ہیں نا بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ان لوگوں نے دونوں کو گھیر لیا۔ وہ تو چندر موہن پر ایسے جھپٹے، جیسے چیل اپنے شکار پر لپکتی ہے، دونوں نے چندر موہن کو لاتوں اور گھونسوں کی زد پر لے لیا۔ اس سے قبل کہ آشا کی چیخیں خاموشی کا قتل کرتیں، باقی لڑکوں نے آشا کو دبوچ کر اس کا منہ دبا دیا اور شاہراہ سے دور ایک گنے کے کھیت کی طرف لے گئے۔ چندر موہن کو بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر وہ بھی مشن میں شامل ہو گئے۔ آشا آسانی سے

ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے پوری طاقت لگا کر ایک لڑکے کے لات ماری۔ دوسرے کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ مگر تعداد پھر بھی اہم ہوتی ہے اور پھر مرد کے مقابلے صنفِ نازک۔ آشا بھی مشٹنڈوں کے گھونسوں اور تھپڑوں کے آگے زیر ہو گئی تھی اور پھر چاروں پانچوں نے آشا کی آشاؤں کو نراشا میں بدلنا شروع کر دیا۔ ہوس کا شیطان اپنا سفر طے کرتا رہا۔ آشا روندی جاتی رہی بالآخر وہ بے ہوش ہو گئی۔ کافی دیر بعد کسی کسان نے انہیں نیم مردہ حالت میں دیکھ کر شور مچانا شروع کیا۔ سارا گاؤں، کھیتوں کی طرف دوڑ پڑا۔ ماتا دین اور شربتی کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ آشا مردہ حالت میں بے سدھ سی پڑی تھی۔ کچھ ہی دوری پر پنڈت مدن کا لڑکا چندر موہن بھی زخم خوردہ، مردہ سا پڑا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے دونوں کو گاڑی میں ڈال کر شہر کے سرکارہ اسپتال میں داخل کرا دیا۔ پولیس بھی حرکت میں آ گئی تھی۔ شربتی کو ہوش نہیں تھا۔ اس کا سب کچھ خاک میں مل گیا تھا۔ ہوش آنے پر اس نے پولیس چوکی پر رپورٹ لکھوا دی تھی۔ رپورٹ تو بے نام تھی۔ لیکن سب کو شک تھا کہ یہ کام مکھیا کے بیٹوں کا ہی ہے۔ پولیس نے چھان بین شروع کر دی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ پولیس کپتان پچھلے ہفتے ہی بدلا تھا۔ اس نے سارے تھانوں کی پولیس کو ٹائٹ کر دیا تھا۔ معاملہ دبانے کی بھی کوششیں جاری تھیں۔ لیکن بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جا رہی تھی۔ اگلے دن اخبارات کی سرخی پر بھی آشا کے زخم اور چندر موہن کے خون کے قطرے نظر آ رہے تھے۔ مکھیا اور اس کے بیٹے گھر چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ پولیس نے دن رات محنت کر کے ایک مجرم کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے تھرڈ ڈگری سے گذرتے ہوئے سب کچھ بتا دیا تھا کہ کس طرح مکھیا اور اس کے بیٹوں نے آشا کے ساتھ اس گھنونے کھیل کا منصوبہ بنایا تھا۔

شربتی اتنی ٹوٹ چکی تھی کہ اب کچھ بچا نہیں تھا۔ آشا زیر علاج تھی۔ شربتی نے ٹھان لیا تھا کہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچائے گی۔ وہ اپنی لڑائی لڑ رہی تھی۔ گاؤں کے اس کی برادری کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ سب ایک ہو گئے تھے آس پاس کے گاؤں کے دلت بھی ساتھ آ گئے تھے اور ایک طاقت بن چکے تھے۔ آہستہ آہستہ معاملہ تحریک بنتا جا رہا

تھا۔ پولیس پر دباؤ بڑھنے لگا تھا اور پھر ایک دن سارے مجرم گرفتار ہو کر جیل چلے گئے تھے۔

....

ادھر آشا اور چندر موہن صحت مند ہو کر شہر ہی میں پڑھنے لگے تھے۔ آشا نے گرلز کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور ہوسٹل میں رہنے لگی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ پہلے وہ تعلیم حاصل کرے گی پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو کر سماج میں پھیلے درندوں سے لڑے گی۔ ادھر چندر موہن نے انجینئرنگ کالج جوائن کر لیا تھا۔ دونوں کی کبھی کبھار ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ مکھیا کے تیور ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ اس نے، ماتا دین اور شربتی پر سمجھوتے کا دباؤ بنایا۔ لالچ بھی دیا۔ جب کوئی ترکیب کام نہ آئی تو دھمکیاں دیں۔ یہی نہیں ایک بار عدالت میں تاریخ کے وقت شربتی پر قاتلانہ حملہ بھی کروایا گیا۔ وہ تو شربتی کی زندگی تھی جو وہ بچ گئی۔

وقت مسکراتا ہوا فراد پور سے گذرتا گیا۔ آشا نے کسی طرح گریجویشن کر لیا تھا، بی ایڈ بھی مکمل کر چکی تھی۔ اسی دوران پردھانی کے الیکشن آ گئے۔ فراد پور گاؤں ایس سی ایس ٹی کے لیے ریزرو کر دیا گیا تھا۔

ماتا دین کی برادری کے لوگوں نے میٹنگ کی۔

”بھئی...... اب بہت ہو گیا اب ہم اور اپمان نہیں سہیں گے۔ چناؤ سر پر ہیں۔ سیٹ بھی ریزرو ہو گئی ہے۔ ہمیں اپنا امیدوار کھڑا کرنا ہے۔ مشورہ دو کسے کھڑا کیا جائے۔“

بابا لکھی رام نے برادری کی میٹنگ میں جب شروعات کی تو سب میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ کئی نام آنے پر اتفاق نہیں ہو پایا۔

”کوئی اور نام ہو____“ دھرم جاٹو بولا

”ارے، آشا کو کھڑا کرو۔ وہ پڑھی لکھی بھی ہے____

”ہاں! ہاں!“ ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

”پر وہ تو شہر میں ہے۔ کیا وہ تیار ہو جائے گی“ ایک آواز ابھری۔

”ہاں کیوں نہیں ہم منا لیں گے اسے“ ایک بزرگ نے بات سنبھالی۔

آشا کے سامنے جب بات آئی تو اس نے بہت غور کیا۔ اسے لگا اب اس کے مشن کا صحیح وقت آ گیا ہے۔ اس نے برادری والوں کی آشا کو پورا کرنے کے لیے حامی بھر لی۔ فراد پور گاؤں میں تقریباً دو ہزار ووٹ تھے۔ 700 سے زیادہ دلت ووٹ تھے جب کہ برہمن، پنڈت، گوجر ووٹ بھی آٹھ سو کے آس پاس تھے۔ مسلمان بھی ایک آدھ سو تھے۔ مالی، کمہار اور گڑریے ملا کر دو ہزار بائیس ووٹ بنتے تھے۔ مکھیا کے زیر اثر برہمن، پنڈت اور گوجر تو تھے ہی۔ رعب داب کی وجہ سے مالی گوجر، کمہار اور مسلمان بھی اسے ووٹ دیتے تھے۔ پر اس بر نقشہ بدل چکا تھا۔ دلتوں کے ساتھ مسلمان بھی آ گئے تھے۔ مالی، کمہار بھی مکھیا سے پریشان تھے۔ گوجر اور پنڈت برادری کے کچھ لوگ اندر اندر مکھیا کو ہرانا چاہتے تھے۔ گاؤں میں دو ہی امیدوار کھڑے ہوئے۔ مکھیا نے اپنے امیدوار کے لیے بہت کوششیں کیں، بڑی زور آزمائی ہوتی رہی۔ الیکشن کے دن خون خرابے کے بھی مواقع تھے لیکن چپے چپے پر موجود پولیس نے حالات پر قابو رکھا۔ ریزلٹ آتے ہی آشا کا پرچم بلند ہو گیا تھا۔ مکھیا کے ارمانوں اور آشاؤں کو آشا نے نراشا میں بدل دیا تھا۔ اب سیاسی طاقت پسماندہ لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ ریاست میں بھی، اقتدار میں تبدیل ہوئی تھی اور دلت حمایت والی سرکار، حکومت میں آ گئی تھی۔

....

شرتی، ماتا دین اور اس کی برادری کے لوگوں میں نیا جوش آ گیا تھا۔ دوسری طرف مقدمات الجھتے الجھتے مکھیا گری راج کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ پہلے بیٹو اور اس کے ساتھیوں کو عمر قید ہوئی پھر زمینیں بکنے شروع ہو گئیں۔ دن بہ دن مکھیا کا فراف تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔

آشا نے گاؤں کو ہر طرح سے سدھارنے کی کوشش کی تھی۔ اسکول کو خوب فروغ دیا۔ لڑکیوں کا الگ سے ایک اسکول بھی بنوایا۔ فراد پور آس پاس کے ضلعوں میں بھی مشہور ہو گیا تھا۔ لوگ اسے آشا کے نام سے پہچانتے تھے۔ ایک دن آشا کی چندر موہن سے

ملاقات ہوئی۔

"تم، آج بھی آشا بن کرب کو مو رہی ہو۔"

شاعری نہیں کرو، یہ بتاؤ یہ چاند آج کل کس کے آنگن میں چمک رہا ہے۔"

کہیں نہیں۔ آج بھی آنگن کی تلاش۔ اس تلاش میں چاند، اپنی چاندنی تک آیا ہے۔"

اوہ یہ بات ہے۔" آشا کے چہرے پر خوشی کے ہلکے سے سائے تھے۔

"میں اپنے بابا سے مشورہ کروں گی"

"کیوں یہ تو تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن ہم لوگ ابھی اتنے ایڈوانس نہیں ہے۔"

ماتا دین نے برادری کے بزرگوں کے سامنے آشا اور چندر موہن کی شادی کی بات رکھی تو برادری کے لوگوں میں ابال آ گیا تھا۔ فوراً ایک میٹنگ رکھی گئی۔ برادری کے ایک بزرگ نے کہا

"آشا ہماری شان ہے۔ آن اور بان ہے وغیرہ برادری میں کیسے شادی کر سکتی ہے سب خاموش ہو گئے تھے۔ ایک پڑھے لکھے نوجوان نے کہا۔

"آشا پڑھی لکھی ہے۔ شادی میں اس کی مرضی شامل ہونی چاہیے۔"

بہت دیر کے بحث و مباحثے کے بعد برادری نے ماتا دین کو سمجھا دیا تھا کہ برادری برادری ہوتی ہے اور اس سے باہر جانا نہ صرف برادری سے غداری ہے بلکہ صدیوں کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔

اور آشا کے آکاش پر سیاہ کثیف بادلوں نے چاند اور چاندنی کے درمیان ہمیشہ کے لیے پردہ کر دیا تھا۔

☆☆

نہ بجھنے والا سورج

دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان صاف تھا۔ بارش بند ہوگئی تھی۔ دھوپ مسکرانے لگی تھی۔۔ ہر چیز دھل کر صاف ستھری اور نکھری نکھری ہوگئی تھی۔ بانو بیل بھینس کو باہر کھور پر باندھ کر ان کے چارے کا انتظام کرنے لگی۔ اتنے میں باہر سے آواز آئی۔

''چٹھی......''

''اری بانو......او بانو......دیکھ......چٹھی آئی ہے......لے لے۔ ضرور آفتاب کی ہوگی......'' بڑھیا رمضانو بولی۔

اتنا سنتے ہی بانو جو کہ جانوروں کا گوبر اٹھا رہی تھی۔ بغیر ہاتھ دھوئے چلاتی ہوئی باہر کو بھاگی...

''لاؤ___ بابو لاؤ......میری چٹھی...''

اور ڈاکیہ سے چٹھی لے کر دوڑتی ہوئی گھر میں آئی۔

''ماں......ماں......وہ منا کدھر ہے۔ ذرا اس سے چٹھی پڑھواتی......''

''ارے ہاں......منا تو کھیت کی طرف گیا ہے۔ آتا ہی ہوگا بس ذرا سی دیر میں۔'' رمضانو بولی۔

مگر خوشی کے مارے بے چین بانو چٹھی لے کر کھیت کی جانب چل پڑی۔ راستے

میں اسے دور سے منا آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ خوشی کے مارے وہیں سے چلائی۔

''منا......دیکھ چٹھی آئی ہے۔''

قریب آتے ہوئے منے کو وہ خط دیتی ہوئی بولی۔

''دیکھ تو کس کی ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ مجھے تو تیرے بھیا کی لگتی ہے۔ ضرور ان کی ہی ہوگی، ہے نا۔''

وہ ایک ہی سانس میں کہے چلی گئی۔ منا چٹھی پڑھنے لگا۔

''ارے زور سے پڑھ......کیا لکھا ہے۔ میں بھی تو سنوں۔'' وہ بولی۔

''بھابی___ بھیا کا خط ہے۔ لکھا ہے کہ وہ اس مہینے کی ۱۲ رتاریخ کو گھر آ رہے ہیں۔'' منا ہنستا ہوا بولا۔

''سچ......سچ......تو صحیح کہہ رہا ہے نا___ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب کے پورے دو سال بعد آ رہے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے منا کے گال کو چوم لیا۔

''ارے آج تو ۶ رتاریخ ہے۔ بس پانچ دن ہیں ان کے آنے کے۔''

گاؤں شاہ پور میں، مٹی کے کچے سے مکان میں ایک چھوٹا سا خاندان رہتا تھا۔ بڑھیا رمضانو اور اس کے دو بیٹے آفتاب اور مہتاب۔ آفتاب کی شادی بانو سے ہوئی تھی۔ شادی کو کئی سال گزر گئے تھے مگر اب تک ان کی محبت کا گلشن ویران پڑا تھا۔ آفتاب بی ایس ایف میں نوکری کرتا تھا۔ ادھر دو برسوں سے دشمن ملک سے جنگ چل رہی تھی۔ اس لیے اسے گھر آنے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ خط میں وہ کئی بار لکھ چکا تھا، بلکہ آنے کی تاریخ بھی دے چکا تھا۔ مگر فوجی اور ڈاکٹر کا ہر پل ادھار ہوتا ہے۔ اس کا سونا جاگنا سب دوسروں کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں اس کا فرض ہی سب سے بڑا رشتہ ہوتا ہے۔

اس بار کمانڈر نے اسے بڑی مشکل سے ایک ہفتے کی چھٹی دی تھی۔ اس نے چھوٹے بھائی مہتاب کو خط کے ذریعہ اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ مہتاب نویں کلاس

کا طالب علم تھا۔ بانو پڑھی لکھی نہیں تھی۔ سانولی سی مگر تیکھے ناک نقشہ والی، آنکھیں بڑی بڑی، ہونٹ پتلے پتلے، دونوں ہونٹوں کے درمیان چمکتے موتی سے دانت، ہنستی تو یوں گمان ہوتا، جیسے سرمئی بادلوں سے بجلی چمک رہی ہے۔ آفتاب کو وہ بہت پسند تھی۔ رمضانو سے تو کچھ ہوتا نہ تھا۔ بانو ہی گھر اور باہر کا کام سنبھالتی تھی۔ روٹی پکانا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا، جانوروں کا خیال کرنا، گوبر کے اپلے بنانا اور کھیت سے گھاس کاٹ کر لانا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہر کام میں ماہر ہو۔ ادھر دو سال سے وہ اپنے شوہر کی یاد میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اسے ہمیشہ اپنے آفتاب کی جان کا خدشہ لگا رہتا۔ کہیں آفتاب غروب نہ ہو جائے اور اندھیرا ہی اندھیرا پھیل جائے۔

آج سارا گھر بہت خوش تھا۔ بانو تو پھولے نہیں سما رہی تھی۔ گھنٹوں آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے میں خود کو سنوارتی رہی۔ آج اس نے نئے نئے کپڑے پہنے تھے جو آفتاب نے اسے پچھلی بار دہلی سے لا کر دیے تھے اور جنہیں آفتاب بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے مانگ میں سیندور، کانوں میں بالی، ناک میں لونگ، ہاتھوں میں چوڑیاں، غرض وہ تمام معمولی زیورات جو اس کی شادی کے تھے۔ زیب تن کر لیے تھے۔ وہ بالکل نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی جیسے آج اس کی برات آ رہی ہو۔ رمضانو بھی بڑی خوش تھی۔ آج اس کا بیٹا آنے والا تھا۔ اس نے رس کی کھیر پکائی تھی۔ آفتاب بڑے چاؤ سے رس کی کھیر کھایا کرتا تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا کوئی بیٹا سرحد پر لڑنے اور وطن کی آبرو کے لیے جان دینے والا سپاہی بنے۔ اسی لیے اس نے آفتاب کو فوج میں بھرتی کرا دیا تھا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ شاید بارہ بج رہے تھے۔ مگر ابھی تک آفتاب نہیں آیا تھا۔ گھر کے تمام لوگ پریشان تھے۔ بانو کبھی سڑک پر آتی اور کبھی اندر گھر میں چلی جاتی۔ ملن کی خوشی اس کے روم روم میں بسی تھی۔ اس کا پورا جسم آنکھوں اور کانوں میں سمٹ آیا تھا۔

انتظار کے پھول مرجھا گئے اور شام کے وقت دروازے پر ڈاکیے کی آواز گونجی.........

"چٹھی......ی......!"

مہتاب نے دوڑ کر خط لے لیا اور پڑھنے لگا۔

پیارے مہتاب!

خوش رہو

مجھے افسوس ہے کہ میں اس تاریخ میں نہ آسکوں گا۔ ادھر جنگ پھر بہت زوروں پر ہے۔ ہماری سرحد پر دشمن فوج نے حملہ کر دیا ہے۔ زندگی نے ساتھ دیا تو اور خدا کی مرضی رہی تو پھر ملیں گے۔ ورنہ.....

فقط

تمہارا بھائی

آفتاب

خط سنتے ہی بانو کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ کھلا ہوا گلاب مرجھا گیا اور ملن کی خوشی کو ہجر کے ناگ نے ڈس لیا۔ اس کی ساس نے اسے سمجھایا____

"بہو.....مت رو____ کیوں روتی ہے.....اللہ سے دعا کر کہ وہ ہمارے ملک کو فتح نصیب فرمائے۔ مجھے بھی تو دیکھ......بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ وہ بھی فوج میں مارے گئے۔ مگر وصیت میں لکھ گئے تھے کہ آفتاب کو فوج میں داخل کروانا____ اور میں نے آفتاب کو فوج میں داخل کروا دیا۔ اس دن سے آج تک دیکھ کتنی خوش ہوں۔ میرا تو وہ بیٹا ہے۔ میں نے دو سال سے اس کی صورت نہیں دیکھی____"

لاکھ ضبط کے باوجود بوڑھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ بانو غمگین ہو گئی۔ اس کے دل میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کا آفتاب بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ بوجھل دل سے کام کاج میں لگ گئی۔

رات اس نے خواب میں سورج گرہن دیکھا۔ روشن سورج آہستہ آہستہ

دھندلکوں میں کھو رہا تھا۔ اس کی زندگی، اس کی روشنی ختم ہوتی جارہی تھی اور وہ لمحہ بھی اس نے دیکھا جب پورا سورج اندھیروں میں اپنی روشنی سمیت تحلیل ہو گیا تھا۔ سورج کا وجود ختم ہو گیا تھا۔ چاروں طرف مکمل طور پر اندھیرے کی حکومت تھی۔

صبح ہی سے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ غیر ملکی فوجیں ناکام ہو گئی تھیں۔ ملک کے جوانوں نے بہت بہادری دکھائی تھی۔ کتنے ہی نو جوان شہید ہوئے تھے۔ فہرست میں آفتاب بھی شامل تھا۔

سارے گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ رمضانو کا بڑا لڑکا آفتاب سرحد پر لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ رمضانو نے جب سنا تو بے ساختہ اس کی زبان سے ''اللہ تیرا شکر ہے'' نکلا۔ بانو کو معلوم ہوا تو اس کی سانس رکنے لگی، اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا کسی نے اس کبوتر کی گردن مروڑنی شروع کر دی ہے جس میں اس کی جان تھی، وہ زار و قطار رونے لگی۔ آنسوؤں کی قطاریں چہرے پر پھیلنے لگیں۔ یہ دیکھ کر رمضانو بولی:

''ارے پگلی.....تو رو رہی ہے.....آج تو جشنے کا دن ہے۔ ہمارا ملک جیت گیا۔ دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑی ہے۔ تو کیوں روتی ہے۔ تیرا آفتاب چھپا نہیں ہے۔ یہ تو عارضی موت ہے۔ وہ شہید ہو کر اور بھی روشن ہو گیا ہے۔ وہ ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ اس کا نام امر ہو گیا ہے۔ دعا کرو ملک کا ہر نو جوان محب وطن ہو، ملک پر جان دینے والا ہو، بیٹی جب وطن کی عزت و آبرو کا سوال ہوتا ہے تو رشتے ناطے نہیں دیکھے جاتے۔ آنسو نہیں بہائے جاتے بلکہ ہمت کے بازوؤں سے کام لیا جاتا ہے۔ آفتاب تو ہمیشہ ملک کے آسمان پر چمکتا رہے گا۔''

☆☆

ایک ادھوری کہانی

'' پھر یوں ہوا کہ اچانک شہزادہ غائب ہو گیا۔۔۔''

شادمانی بیگم سانس لینے کو رکیں تو بچوں کے سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

''نانی آپا! ایسا کیسے ہو گیا۔۔؟'' ریحان کا تجسس اس کی زبان پر آ گیا۔

''دادی آپا! شہزادہ کہاں چلا گیا؟ کیا پری اسے لے گئی؟'' سمیہ کی حیرانی بڑھ گئی تھی۔

''کیا وہ اب کبھی نہیں آئے گا'' حمیرا نے بھی اپنا سوال چھوڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑے بیگم شادمانی کو دیکھ رہی تھی۔ سبحان اور حیا بھی گم صم سے بیٹھے تھے۔

بیگم شادمانی اپنے پوتے۔ پوتیوں، نواسے۔ نواسیوں کے درمیان گھری بیٹھی تھیں۔ بچے ان سے ضد کر کے کہانی سن رہے تھے۔ بیگم شادمانی کہانی سنانے میں ماہر تھیں۔ بچے ان سے بہت مانوس تھے۔ وہ جب بھی رات کو نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر اپنے بستر میں جاتیں، بچے ایک ایک کر کے ان کے بستر میں آ دھمکتے۔ بیگم شادمانی بچوں کو راجا۔ رانی، دیو۔ جن، پری، شہزادہ۔ شہزادی کی دلچسپ کہانیاں سناتیں اور بچے بڑے انہماک سے سنتے۔ بعض بچے تو سنتے سنتے نیند کی وادی میں چلے جاتے۔ بعض کو نیند کے جھونکے آتے رہتے، مگر وہاں سے جانے کو راضی نہ ہوتے۔ دیر رات ان کی مائیں اپنے بچوں کو اپنے کمروں اور بستروں میں لے جاتیں۔ اکثر بیگم شادمانی سے کہانی سننے کے بعد

ہی بچوں کو نیند آتی۔ انہیں زیادہ تر لوگ شاد مانی آپا کہتے۔ 'آپا' ان کے نام کے ساتھ ایسا جڑا گویا ان کی کنیت ہو۔ کیا بچے، کیا بڑے، سبھی انہیں آپا کہتے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ کوئی انہیں شاد مانی آپا کہتا، تو کوئی انہیں پھوپھی آپا، پوتے۔ پوتیاں، نواسے۔ نواسیاں تو انہیں نانی آپا اور دادی آپا کہتے۔ ابھی کل ہی تو وہ ایک دلچسپ کہانی سنا رہی تھیں کہ ان کی لاڈلی پوتی سمیہ، جو چھ سال کی تھی ضد کرنے لگی۔

''دادی آپا، دادی آپا، ہمیں اپنی کہانی سناؤ نا! ہمیں آپ کی کہانی سننی ہے۔''

پوتی کے منہ سے یہ سن کر شاد مانی بیگم لمحہ بھر کو چونک گئی تھیں۔ وہ ماضی جو وہ بھول گئی تھیں اور جسے یاد کرنے کی نہ ہمت تھی نہ ضرورت۔ بچی کی فرمائش پر پہلے تو انہوں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''بیٹا میری کوئی کہانی نہیں، میں تمہیں 'سمارا' پری کی کہانی سناتی ہوں''

''نہیں دادی آپا! ہم نہیں سنتے۔'' سمیہ نے اس طرح منہ بنایا اور دوسری طرف گھوم گئی، گویا ناراض ہوگئی ہو۔ کتنی پٹاخہ تھی، شیطان کی نانی کہیں کی۔

''نانی آپا! ہم تو آپ کی کہانی سنیں گے بس'' ریحان نے معاملے کو اور الجھا دیا۔

''اچھا میں کل سناؤں گی......'' بیگم شاد مانی نے پھر ٹالنے کی کوشش کی۔

''او کے نانی آپا......'' ریحان بولا۔

''میری پیاری نانی آپا.....'' حمیرہ نے بھی ساتھ دیا۔ حنا تو لپک کر ان کی گود میں بیٹھ گئی۔

اس دن تو بات ٹل گئی تھی۔ لیکن بچے کہاں ماننے والے تھے۔ انہوں نے بیگم شاد مانی کو اگلے دن وقت مقررہ پر پکڑ ہی لیا۔ بیگم شاد مانی بمشکل تمام اس سخت مرحلے کے لئے تیار ہوئیں۔

''اچھا تو لو سنو۔۔۔ میں تمھیں ایک شہزادے کی، سچ مچ کے شہزادے کی کہانی سناتی ہوں۔۔۔ ایک تھا شہزادہ تھا، واقعی شہزادہ تھا وہ، وہ رنگ میں تو سانولا تھا مگر ذہن اور عقل و فہم

میں، اخلاق و کردار میں، خدا ترسی میں، غریب پروری میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے پردادا انگریزوں کے زمانے میں ایس پی تھے۔ ان کی انگریزوں سے خوب چھنتی تھی۔''

''دادی، یہ چھنتی، کیا ہوتا ہے؟''

سمیہ نے بیچ میں ٹوک دیا۔ معصوم سے سوال پر بیگم شاد مانی کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور سمیہ کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

''چھنتی کا مطلب...... ہوتا ہے۔ دوستی ہونا، سمجھیں؟''

''انگریز تو انگریزی بولتے ہوں گے پھر وہ کیسے سمجھتے ہوں گے؟'' سبحان بھی بول پڑا

''ارے بھیا، ان کے پردادا بھی انگریزی جانتے تھے اور انگریزی میں باتیں کرتے تھے۔''

''اچھا سنو! وہ شہزادہ ریاست دولت پور کا رہنے والا تھا۔ دولت پور بہت بڑا قصبہ تھا۔ اور سیدوں کا قصبہ کہلاتا تھا۔ وہاں زیادہ تر سید آباد تھے۔ اور سب کے سب رئیس تھے۔ دولت پور باغات کے لئے مشہور تھا۔ آم کے باغات میں دسہری، لنگڑا، گلاب جامن، چوسا اور رٹول کی فصل ہوتی۔ آم کے علاوہ لیچی اور امرود کے باغات بھی تھے۔ دولت پور کے نچلے طبقے کے لوگ اور غریب مزدور باغات میں محنت مزدوری کرتے۔ باغات کے علاوہ کھیتی باڑی بھی ہوتی۔ سال میں دو بار فصلیں اگاتے۔ گیہوں، چاول اور مکا کے علاوہ یہ علاقہ گنے کے لئے بھی مشہور تھا چھوٹے بڑے ہر طرح کے کسان تھے۔ کچھ تو خود اپنی کھیتی کرتے۔ زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ امیروں اور رئیسوں کے باغات اور کھیتوں میں کام کرتے۔ باغات کی فصل کا جب موسم آتا تو علاقے کی رونق دیکھنے لائق ہوتی۔ ہر طرف آم ہی آم۔ باغ کے ٹھیکے دو سال کے لئے چھوڑ جاتے۔ ٹھیکے میں سو پچاس پیٹی آم مالک کو الگ سے ملتے۔ جن کا استعمال اکثر لوگ سرکاری افسروں اور دوست احباب کے یہاں تحفے بھیجنے میں کرتے ہیں۔ اس طرح جاڑوں کے موسم میں جب گنے کا موسم ہوتا تو پورے علاقے کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ زیادہ تر کسان اپنا گنا، چینی ملوں میں لے جاتے وہاں سے پرچی ملتی، پرچی سے بعد میں بینکوں سے پیسے مل جاتے۔ بہت سے کسانوں نے کولہو بھی لگا

رکھے تھے۔ کولہوؤں پر گنے سے گڑ تیار کیا جاتا۔ جب گڑ کڑھاؤ میں کھولتا تو اس کی میٹھی میٹھی خوشبو سے پورا علاقہ معطر ہو جاتا۔

میں جس شہزادے کی کہانی تمہیں سنا رہی ہوں۔ اس کا گھر اور اس کا خاندان دولت پور کے پڑھے لکھے لوگوں اور سرکاری عہدوں کی وجہ سے بڑے بڑے دولت مندوں سے زیادہ مشہور تھا۔

''کچھ پتہ ہے اس شہزادے کا نام کیا تھا۔؟''

''نہیں نہیں۔ آپ بتاؤ نا!'' ایک ساتھ سبھی بول پڑے

''اس کا نام سید قمر الدین تھا۔ قمر یعنی چاند، واقعی وہ شہزادہ پورے علاقے میں چاند جیسا ہی تھا۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ اس کے پردادا سید عبدالحئی انگریزوں کے دوست تھے۔ اور ضلع کی ایس پی تھے۔ اکثر انگریز ان کے گھر مہمان ہوتے۔ جب بھی انگریز آتے۔ عبدالحئی کے گھر دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ سفید چٹے اور سرخ سفید رنگت والے انگریزوں کو لوگ یوں دیکھتے گویا نئی مخلوق الٹز دنیا میں آ گئی ہو۔ انگریز دن میں وسیع و عریض دالانوں میں آرام فرماتے۔ ان کے آرام کے لئے نوکر چاکروں کی پوری ٹیم لگی ہوئی تھی۔ مشروب آرہے ہیں۔ کھانے کی انواع و اقسام حاضر ہیں۔ انگریز ویسے تو سگار کے شوقین تھے لیکن دولت پور آ کر انہیں حقہ اتنا پسند آیا کہ انہیں اس کی لت لگ گئی تھی۔ ہر دم حقہ تازہ کیا جاتا۔ چلم بھری جاتی رہتی اور انگریز خوبصورت چادر بچھی چارپائیوں اور نواڑ کے پلنگوں پر لیٹے اور بیٹھے حقے کی لمبی سی نے، منہ میں دبائے حقہ گڑگڑاتے رہتے۔ انہیں حقے کا گڑگڑانا بہت اچھا لگتا تھا۔ انگریز جب ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بولتے تو گاؤں اور قصبے کے لوگ ہنسا کرتے۔

''او مین! ہم کیا کرتا۔''

''ہم وہائی بنےگا۔''

اور لوگوں کے پیٹوں میں ہنستے ہنستے بل پڑ جاتے۔ رات کو عبدالحئی انگریزوں کو

شکار پر لے جاتے۔ گھنے جنگلوں میں بارہ سنگھا، ہرن، نیلا، سانبھر، پہاڑا اور کبھی کبھی تیندوے کا بھی شکار ہو جاتا۔ انگریزوں کی بندوقیں بہت اچھی تھیں۔ ایک بھی فائر نشانے پر لگتا تو جانور ڈھیر ہو جاتا تھا۔ جانور کے گرتے ہی ملازمین جا کر اسے ذبح کرتے اور گوشت بناتے۔ انگریزوں کو گوشت کا بڑا شوق تھا۔ وہ بھنا ہوا گوشت اور کباب بہت زیادہ پسند کرتے تھے۔ شکار کے جانوروں کی کھال سکھائی جاتی، پھر اس میں دوائیاں اور مسالے لگائے جاتے، بعد میں ان میں بھس اور دوسری ہلکی چیزیں بھر کر ایسا بنا دیا جاتا گویا دوبارہ زندہ ہو اٹھے ہوں۔ پورا جانور، جانوروں کے سر، اور ان کی کھالوں کو مہمان خانے کے بیچ میں، دیواروں پر اور کونوں میں سجایا جاتا۔ مہمان خانے میں داخل ہوتے ہی بعض لوگ تو ڈر ہی جاتے۔ ان سے کیا رعب قائم ہوتا تھا، کیا شان ٹپکتی تھی۔ شکار، دولت پور کے زیادہ تر سیدوں کا شوق بھی تھا اور کمزوری بھی۔

شہزادہ قمر الدین کے دادا سید نجم الدین اپنے وقت کے بہت بڑے ڈاکٹر تھے۔ دولت پور اور آس پاس کے لوگوں کا علاج کرتے۔ پھر جب جنگِ آزادی کی لڑائی میں گاندھی جی نے 'عدم تعاون' تحریک چلائی تو سید نجم الدین بھی اس تحریک میں شریک ہو گئے۔

''دادی، دادی، یہ عدم تعاون تحریک کیا ہے؟'' حمیرا نے اپنا تجسس ظاہر کیا

بیگم شادمانی مسکرائیں۔ اور بولیں۔

''بچو تمہیں یہ تو پتہ ہے کہ ہمارے ملک پر انگریزوں کا قبضہ تھا؟''

''جی! دادی''

''انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ہمارے لیڈروں نے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں۔ انہیں میں سے ایک تحریک جو گاندھی جی نے چلائی تھی، اس کا نام عدم تعاون تحریک ہے۔ عدم تعاون یعنی ہم ہر کام میں اب آپ کی مدد نہیں کریں گے۔ جب گاندھی جی نے یہ نعرہ دیا تو لوگوں نے سرکاری عہدے چھوڑ دیے۔ وکیلوں نے وکالت

چھوڑ دی۔ سرکار کی مدد کرنے اور اس کی مدد لینا، دونوں کام چھوڑ کر لوگ میدان میں آگئے۔ بچو، اس سے آزادی کی لڑائی کو بہت طاقت ملی۔۔۔ اونہہ۔۔۔ اُکھو۔۔۔ اکھ۔۔ کھا" اور بیگم شادمانی کو کھانسی آگئی، کھانسی پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے دوبارہ کہانی شروع کی

"شہزادہ کے والد بہت بڑے تاجر یعنی بزنس مین تھے۔"

"دادی، جلدی سے شہزادے کے بارے میں بتائیے نا!" بچوں نے یک زبان کہا۔

"بتاتی ہوں! شہزادہ اپنے گھر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے تین بہنیں تھیں۔ بچپن ہی سے شہزادہ بہت ذہین، تیز طرار اور شرارتی تھا۔ شہزادہ کی دادی بھی بڑی نیک اور گھریلو خاتون تھیں شہزادہ کی ماں معمولی پڑھی لکھی تھیں۔ مگر انہیں پڑھنے کا خوب شوق تھا۔ افسانے اور ناول پڑھنا ان کا جنون تھا۔ وہ خود بھی کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ بہت سمجھ دار خاتون تھیں۔ عورتوں کی تعلیم کی حامی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بچپن ہی سے شہزادہ اور اس کی بہنوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا۔ شہزادے کو دہلی کی جامعہ میں اور اس کی بہنوں کو علی گڑھ ہم تعلیم کے لئے بھیجا۔ شہزادے نے جامعہ میں خوب نام کمایا۔ ہر طرح کے مقابلوں میں ہمیشہ اول آتا۔ بیت بازی کا ماہر تھا اور خود بھی شعر کہنے لگا تھا۔ اس کی نظمیں تو بڑی پر اثر ہوتی تھیں۔ پھر شعر پڑھنے کا اس کا الگ انداز۔ جامعہ سے پڑھنے کے دوران ہی شہزادے کے والد کا انتقال ہو گیا۔ شہزادہ مشکل سے پندرہ سال کا ہوگا۔ اچانک سر سے سایہ اُٹھ جانے سے شہزادے کو بہت رنج و ملال ہوا۔ مگر مرضی الٰہی کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ شہزادے پر اب گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی آ گیا تھا تین تین بہنیں اور ماں، اب سب کچھ اسے ہی دیکھنا تھا۔ اسی لئے اس نے دہلی سے پڑھائی ختم کر کے دولت پور میں ہی پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

کہانی سناتے سناتے بیگم شادمانی نے دیکھا سمیہ سو گئی ہے۔ حیا اور سبحان بھی اونگھ رہے ہیں۔ باقی بچے بھی کچھ جاگے کچھ سوئے لگ رہے تھے۔

"بچو چلو اب اپنے اپنے بستروں میں جاؤ۔ اب کہانی کل ہوگی۔"

بیگم شادمانی کے کہانی بیچ میں روکنے کے فیصلے سے ناراض ریحان، آنکھوں میں نیند لئے وہاں سے جانے تو لگا مگر جاتے جاتے بولا۔

"نانی آپا! میں نا کل ضرور شہزادے کی آگے کی کہانی سنوں گا"

"ٹھیک ہے۔ خدا حافظ، شب بخیر۔۔۔ سب کہیے۔۔ شب بخیر۔۔"

"شب بخیر۔۔"

سارے بچے ایک ساتھ بول پڑے۔

بچے جا چکے تھے۔ بیگم شادمانی اپنے بستر پر تنہا رہ گئی تھیں۔ انہیں یاد آیا آج تو انہوں نے عشاء کی نماز بھی نہیں پڑھی۔ گھڑی دیکھی رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ انہوں نے وضو کیا اور نماز کی چوکی سنبھال لی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔

"اے اللہ تو انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرنا۔ اللہ ہم سب کو بخش دینا، میرے بچوں کو نیک راہ پر چلانا۔"

بیگم شادمانی کے ایک بیٹا سید ضیاء الدین اور ایک بیٹی سید صبا قمر تھی۔ بیٹی ایک پرائیویٹ کمپنی میں بڑے عہدے پر تھی۔ اس کے شوہر سید غفران ایک بڑی کمپنی میں جی ایم تھے۔ ان کے دو بچے، سبحان اور حیا تھے۔ بیٹا ضیاء میڈیکل کالج میں پروفیسر تھا۔ اس کی دو بیٹیاں سمیہ اور حمیرا اور ایک بیٹا ریحان تھا۔ سارے بچے چھوٹے تھے۔ چار سال سے دس سال تک کے بچے، جب بھی گرمی کی چھٹیاں ہوتیں، صبا بھی آ جاتی اور سارے بچے مل کے گھر سر پر اٹھا لیتے، ساتھ میں دادی اور نانی یعنی بیگم شادمانی کو بھی ساتھ لئے پھرتے۔ بیگم شادمانی پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتیں۔ کہانی سنانا ان کا بچپن کا شوق تھا۔ جب وہ چھوٹی تھیں تو اپنی دادی اور نانی سے خوب کہانیاں سنتی تھیں۔ اور اب جب بزرگی نے اپنا لیا تو کہانیاں سنانا، ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ اپنی

دادی۔نانی کی ادھوری کہانیوں کو پورا کرتیں اور دلچسپ انداز میں کہانیاں سنایا کرتیں۔ان کے شوہر کا انتقال ابھی پانچ چھ سال قبل ہی ہوا تھا۔بھرا پرا گھر، آندھی میں تنکوں کی طرح بکھر کے رہ گیا تھا۔بیٹا جاب کے سلسلے میں باہر تھا۔بیٹی کی شادی ہو چکی تھی، وہ بھی دوسرے شہر میں تھی۔شوہر کے انتقال کے بعد اب ان کا کوئی نہیں تھا۔یوں تو ان کا میکہ بھی دولت پور میں ہی تھا۔بھائی، بھابھیاں، والدین، سب تھے مگر ان کی ذاتی تنہائی دور کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس بار علاقے کے حالات خراب تھے۔مظفر نگر فسادات نے گاؤں دیہات اور قصبات میں بھی نفرت کے بیج بو دیے تھے۔فرقہ پرستی ہر طرف اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا رہی تھی۔شہزادے نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی تھی۔وہ تو انسان دوست تھا۔غیر مسلموں کے ساتھ اس کی بڑی دوستی تھی۔پھر وہ سب کی مدد کرنے کے بھی عادی تھے۔غیر مسلم طلبہ و طالبات کی بھی مدد کرتے۔انہوں نے آئی اے ایس کا امتحان پاس کیا تھا۔لیکن گھریلو مجبوریوں اور ذمہ داریوں نے قدموں میں زنجیر ڈال رکھی تھی۔باغات کی رکھوالی، بہنوں کی شادی، ضعیف ماں کی امیدیں، جائداد کی دیکھ ریکھ، اور والد کے چھوڑے کاروبار کی نگرانی، اوپر سے ٹرانسفر کے جھمیلے۔بالآخر انہوں نے نوکری جوائن نہیں کی۔ویسے بھی شہزادے کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔آگے پیچھے نوکر چاکر، باغات کی لاکھوں روپے کی آمدنی، کھیتی کی زمینوں کی آمد الگ، پھر والد کے چھوڑے کاروبار سے بھی معقول آمدنی کا سلسلہ تھا۔گھر پر گائے، بھینسیں، گھوڑے، رتھ، بگھیاں اور موٹر تک موجود تھی۔

شہزادے کا ذہن بہت وسیع تھا۔وہ دل کے بھی بڑے تھے۔غریبوں، محتاجوں، بیماروں، کی ہر ممکن مدد کرنا ان کا شوق تھا۔

''ہر ہر مہادیو۔۔۔بول بم۔۔۔بول بم۔۔۔''

باہر سے آتی نعروں کی آواز پر بیگم شادمانی یادوں کے کارواں کو چھوڑ کر حال میں واپس آ گئیں۔دراصل باہر کا یہ شور کانوڑ یاترا کا شور تھا۔کیا شہر، کیا قصبہ، کیا دیہات۔۔۔ہر جگہ زعفرانی رنگ اور کان پھوڑتی آوازیں۔

''بول بم۔۔۔بول بم۔۔۔''

اتفاق سے اس بار کانوڑ یاترا اور رمضان ایک ہی وقت آ گئے تھے۔مسلمان روزے رکھتے، نمازیں پڑھتے، اور ہندو کانوڑ کے لئے

ہری دوار جاتے اور بڑی عقیدت کے ساتھ وہاں سے گنگا کا پانی لا کر شولنگ پر چڑھاتے۔ویسے تو سب ٹھیک تھا مگر پولس انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے، کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔

شادمانی بیگم، اپنے بچوں کی طرف سے بڑی فکر مند تھیں۔اب تو یہ بچے ہی ان کی کائنات تھے۔وہ ان سب کے لئے اور ملک کے لئے ہمیشہ دعا کرتیں۔

''اے پروردگار! میرے بچوں کی حفاظت فرما، تمام مسلمانوں کی حفاظت فرما۔ہمارے ملک میں امن وامان قائم فرما۔یا خدا! تجھے تیرے نبی کا واسطہ۔۔۔''

اگلے دن شام ہوتے ہی ریحان ان کے آس پاس منڈلانے لگا تھا۔

''بیٹا ابھی جاؤ، کچھ پڑھائی کرلو۔''

سمیہ پڑھائی کی شوقین تھی۔حنا کو بھی پڑھنا اچھا لگتا تھا، وہ دونوں خود کتابیں لے کر بیٹھ جاتیں۔تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ اچانک شور ہوا اور ضیا اور صبا، ان کے بچے وغیرہ بھی آ دھمکے۔بچوں نے اپنے والدین کو بتا دیا تھا کہ دادی آپا شہزادے کی سچی کہانی سنا رہی ہیں۔تو بچے اپنے والدین کو بھی گھسیٹ لائے۔

''امی! ہم بھی سنیں گے کہانی۔۔۔'' ضیا نے جب کہا تو بیگم شادمانی جذباتی ہو گئیں، انہیں اپنے شوہر کی یاد آ گئی۔وہ اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔

''کیوں نہیں بیٹا! آؤ، تم بھی بیٹھ جاؤ۔۔''

''ارے حنا، ذرا امی کے لئے ایک کپ چائے لیتی آنا۔''

ضیاء نے اپنی بیوی کو پکارا۔ حنا چائے لے کر آئی تو خود بھی مجلس میں بیٹھ گئی۔ صبا بھی کاموں سے فارغ ہو کر شامل ہو چکی تھی۔

''لو سنو! تو ہوا یہ کہ والد کے انتقال کے بعد شہزادے نے سب کچھ سنبھال لیا۔ پڑھائی بھی کرنی اور کاروبار بھی دیکھنا۔ کھیتی باڑی، باغات، نوکر چاکر۔۔۔ سب پر انہوں نے اپنا کنٹرول کر لیا تھا۔ شہزادے کو شکار کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے بچپن ہی میں بندوق چلانے اور نشانہ بازی سیکھ لی تھی۔ دراصل دولت پور کے سیدوں میں شکار کے ساتھ ساتھ نشانہ بازی کا بھی شوق تھا۔ کئی بچے تو نشانہ بازی میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر نام کما چکے تھے۔

اکثر شہزادہ رات کو شکار پر نکل جاتا۔ صبح تک شکار کھیلتے اور کئی جانور شکار کر لاتے۔ ذبح کر کے گوشت پورے محلے میں تقسیم کر دیا جاتا۔ غریبوں کا خاص خیال رکھا جاتا۔ ایک بار کی بات ہے۔۔۔ شہزادہ رات میں شکار کھیل رہا تھا۔ ساتھ میں ان کے دوست جو نیپال سے آئے ہوئے تھے، اور ملازمین بھی تھے۔ ایک بارہ سنگھا کے پیچھے جیپ دوڑ رہی تھی۔ اچانک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے سامنے تیندوا آ گیا۔ ڈرائیور مہندر نے زور سے بریک لگائے۔ سارے لوگ آگے کی طرف جھک سے گئے تھے۔ تیندوے کو دیکھ کر بھی خوفزدہ سے تھے۔ شہزادے نے بندوق سنبھالی، نشانہ لگایا اور فائر کر دیا۔ جنگل کی خاموشی اور تیندوا، دونوں نے دم توڑ دیا۔ شہزادہ جیپ سے کود کر تیندوے کی طرف دوڑ پڑا۔ اچانک مردہ تیندوے میں جان پڑ گئی، وہ زخمی حالت میں ہی شہزادے پر جھپٹ پڑا۔ ملازمین اور شہزادے کے نیپالی دوست ہکا بکا سے جیپ میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ شہزادے کی مدد کرتا۔ شہزادہ تیندوے سے متصادم تھا۔ تیندوے کی دہاڑ پورے۔۔۔۔۔ علاقے کو دہلا رہی تھی۔''

بیگم شادمانی تھوڑی دیر کے لئے چائے لینے کو رک گئیں۔ تو ایک ساتھ سوالوں کی بوچھار ہونے لگی۔

''آگے کیا ہوا دادی۔۔۔۔۔''

''کیا شہزادہ مر گیا۔۔۔۔۔۔''

''کیا شہزادے کو تیندوے نے کاٹ لیا۔''

''بس کرو۔ میں بتاتی ہوں۔ شہزادے کے ہاتھ میں بندوق ضرور تھی لیکن اس کے کارتوس ختم ہو چکے تھے۔ شہزادہ بہت ہمت والا تھا۔ اس نے بندوق کو لاٹھی کی طرح استعمال کر لیا۔ دو تین وار زخمی تیندوے پر کئی وار خاصے سخت تھے۔ تیندوا خطرناک دہاڑوں کے ساتھ زمین بوس ہو گیا۔ پیچھے سے ملازمین دوڑے اور زخمی شہزادے کو جیپ میں ڈال کر فوراً اسپتال لے آئے۔

''پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔۔'' سوال نے پھر ہمت کی۔

''کیا شہزادہ بچ گیا۔۔۔۔۔۔'' دوسرا سوال بھی قطار میں لگ گیا تھا۔

''کئی ہفتے کے علاج کے بعد شہزادے کے زخم بھر گئے تھے۔ اب وہ پہلے کی طرح صحت مند ہو گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ شہزادے کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اب تو شہزادہ راتوں رات اسٹار بن گیا تھا بس۔۔۔ کہانی ختم۔۔۔''

''نہیں۔ نہیں کہانی اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئی۔'' حمیرا نے احتجاج درج کیا

''دادی یہ تو چیٹنگ ہے'' سمیہ بھی بول پڑی۔ ''ہم تو پوری کہانی سنیں گے۔''

''شہزادے کی شادی ہوئی یا نہیں دادی۔۔۔۔۔۔'' بچوں نے اور ساتھ ہی بچوں کے والدین نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔

''اچھا، چلو تم کہتے ہو تو اس کی شادی بھی کروا دیتے ہیں۔''

بیگم شادمانی یہ کہتے ہوئے ایک عجیب سے جذبے سے معمور ہو گئی تھیں۔ ان کی آواز رندھنے لگی تھی۔

''بچو! شہزادے کی شادی کی کہانی سنو گے؟''

''ہاں۔سنیں گے.... ''سب یک زبان تھے۔

''تو سنو۔اس سے قبل کہ شہزادے کی شادی ہو میں تمہیں شہزادے کی ہونے والی بیوی، یعنی شہزادی کی کہانی سناتی ہوں........''

''واہ! ۔اب آئے گا مزہ.......... ''ریحان خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔وہ اپنی امی کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔

جس دولت آباد کا میں ذکر کر رہی تھی ۔اسی میں سیدوں کا ایک اور باوقار گھرانہ تھا،سید سلیم الدین کا پورے علاقے میں چرچا تھا۔ان کا بڑا رعب داب تھا۔ان کے والد سید اللہ راضی بہت بڑے زمین دار تھے۔ان کے گھر پر ہی عدالت لگا کرتی تھی ۔اس خاندان میں پیسہ بھی تھا اور سیاسی قوت بھی ۔آس پاس کے علاقے میں شہرت تھی، جب دولت پور میں پنچایتی انتخاب شروع ہوئے تو اسی گھرانے کے لوگ چیر مین چنے گئے۔ نصف صدی سے بھی زائد سے اس گھرانے کے لوگ چیر مین بنتے آئے ہیں۔سید نسیم الدین کے دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔سید نسیم الدین بہت ملنسار، خوش اخلاق، ماہر سیاست داں اور بڑے زمین دار تھے۔وہ عبادت و ریاضت میں کافی آگے نکل چکے تھے۔ان کی بزرگی کے بھی بہت چرچے تھے۔ان کی سب سے چھوٹی بیٹی شادیہ بے حد خوبصورت تھی۔بارہ۔تیرہ سال کی ہی تھی کہ اس کی خوبصورتی اس قدر نکھری کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔گول مٹول سا چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ،موتی جیسے چمکتے دانت، آنکھیں گویا پیالوں میں سمندر، بوٹا سا قد، بالکل گوری چٹی ،ٹھوڑی پر کالا مسہ گویا قدرت نے نظر بد سے بچانے کو ہمیشہ کے لئے لگا دیا ہو۔کالے سیاہ لہراتے بال جیسے برسات کے موسم میں آسمان پر لہراتا بادل کا ٹکڑا۔چال میں پھرتی ،ہرن بھی شرما جائے۔کام میں چستی ،وقت خود پر لجائے۔آواز میں مٹھاس اور سریلا پن ایسا جو سنے،سنتا ہی رہ جائے۔وہ واقعی شہزادی تھی۔نہیں دولت پور

کی سرزمین پر اُتر آئی ایک پری تھی ۔وہ ننھال کی طرف سے بھی بڑے زمین دار سید غلام مصطفی کے خاندان اور ددھیال کی طرف سے بھی نامور خاندان سے تھی۔دونوں خاندانوں میں بلکہ پورے دولت پور میں کوئی لڑکی اس کے ہمسر نہیں تھی ۔گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہزادی کو علی گڑھ بھیج دیا گیا۔وہاں بھی شہزادی نے سب کا دل موہ لیا۔ استانیاں اس کے حسن پر فدا تھیں۔سہیلیاں اسے دیکھ کے عش عش کرتیں۔

''دادی .... ذرا رکو،نا........ یہ بتاؤ کیا وہ آپ سے بھی خوب صورت تھی؟''سمیہ نے معصومیت سے ایسا سوال کیا کہ بیگم شادمانی ،ایک لمحے تو چکرا کے رہ گئیں۔پھر سنبھل کر بولیں۔

''سمیہ بیٹا، میں کوئی خوبصورت ہوں۔میری عمر دیکھو پھر اس کی عمر....... کتنا فرق ہے؟''

سمیہ نے غلط نہیں کہا تھا۔بیگم شادمانی ساٹھ کی ہونے کے بعد بھی بہت خوبصورت اور چاق چوبند تھیں۔ان کے چہرے سے نور ٹپکتا تھا۔ان کی آنکھیں بہت پر کشش تھیں۔

''اچھا بچو! چلو بس۔۔اب کہانی یہیں ختم۔۔۔پھر کل ملیں گے۔''

''دادی،دادی۔۔''سمیہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

''نانی۔۔۔اور کہو نا۔۔۔شہزادی کے بارے میں اور بتاؤ نا۔۔۔''حنا نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب کل۔۔۔چلو۔۔سب اپنے بستروں میں،کل اسکول بھی جانا ہے۔''

اور سب ایک ایک کر کے یوں چلے گئے، جیسے میلے کی دوکانیں اُٹھ گئی ہوں۔بیگم شادمانی نے نماز چوکی سنبھال لی۔دیر رات تک عبادت میں مشغول رہیں اور پھر نیند نے انہیں اپنی نرم گرم باہوں میں چھپا لیا۔

انہوں نے دیکھا وہ ایک دکان کے اندر کھڑی ہے۔

''ذرا وہ سوٹ دکھا دیں۔ ہاں وہی ہرے رنگ کا۔''

''یہ کس ریٹ کا ہے؟''

''بہن جی! ایک ہزار روپے کی رینج کا ہے۔ آپ کو جو کچھ بھی چاہیے لے لیجئے، مناسب پیسے لگ جائیں گے۔''

''اچھا تو وہ سفید، سیلف والا، اور وہ، ہلکا نیلا بھی نکال دیں۔ ان سب کے پیسے بتا دیں''

''بہن جی چار ہزار دو سو ہوتے ہیں، آپ چار ہزار دے دیں۔''

وہ ابھی پیسے گن ہی رہی تھی کہ ایک آواز نے اسے حیران کر دیا۔

''میرے لئے بھی ایک شرٹ لے لو۔''

یہ آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ ابھی ایک حیرت سے پردہ اٹھا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے دیکھا، ضیاء کے ابو دوکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ وہ مبہوت سی انہیں دیکھے جا رہی تھی کہ اچانک وہ باہر کی طرف چلے گئے۔ دوکان دار کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

''بہن جی! یہ بل ہے آپ کا''

دوکاندار نے بل اور لفافے تھما دیے تھے، وہ جلدی سے دوکان کی سیڑھیاں اترتی ہوئی باہر آئی، اور ایک طرف کو چل دی، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ ان کو تلاش کرتی رہی۔ مگر ان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ یا خدا یہ کیا تھا؟ بہت زور کے بریک لگنے اور ہورن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی، اور اس کا خواب ادھورا رہ گیا۔

اگلے دن اس نے غریبوں میں کپڑے صدقے کر دیے تھے۔

ایک صبح جب وہ فجر کی اذان پر سو کر اٹھیں تو انہیں ہلکا ہلکا بخار تھا۔ نماز پڑھ کر وہ

پھر بستر میں بیٹھ گئیں اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ اتنے میں ضیاء ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''السلام علیکم امی جان۔''

شادمانی بیگم نے سلام کا جواب دیا۔ بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا، ہاتھ ذرا چہرے سے چھوا تو ضیاء اچانک اچھل گئے۔

''ارے امی! آپ کو تو بخار ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔ چائے وغیرہ پی کر دوا لے لیں۔ میں ابھی حنا کو بھیجتا ہوں''

اور تھوڑی دیر میں حنا کوزی میں چائے، دودھ، چینی اور بسکٹ لئے حاضر ہو گئی۔

''امی لیجئے! چائے لیجئے۔'' حنا نے چائے بنا کر شادمانی بیگم کو دی اور خود بھی چائے لے کر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''امی اب آپ آرام کیا کریں۔ آپ کی عمر ایسی نہیں ہے۔''

''میں کیا کرتی ہوں بیٹا، بس تھوڑا ٹہل لیتی ہوں، دو ایک گھنٹے تلاوت، نمازیں اور بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی ہوں، بس۔۔۔ یہ بھی کوئی کام ہیں۔''

''امی اب آپ کو زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ ان چھوٹے موٹے کاموں سے بھی تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ بستر پر ہی نماز ادا کر لیا کریں۔ اور یہ کہانی وہانی سنانا آج سے بند۔ دو تین گھنٹے آپ بے آرام رہتی ہیں۔'' حنا کو اپنی خوش دامن جو اس کی پھوپھی بھی تھیں، کا بہت خیال تھا۔

''نہیں بیٹا! اس طرح تو میں اکیلی ہو جاؤں گی اور زیادہ بیمار پڑ جاؤں گی، پھر مجھے تنہائی اور اکیلا پن کاٹنے کو دوڑتا ہے۔''

''اچھا اب آپ آرام کریں۔ اور یہ دوا لے لیں''

حنا نے شادمانی بیگم کو تازہ پانی سے دوا کھلائی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شادمانی بیگم نے بہو کو دعائیں دیں۔ اور بستر پر دراز ہو گئیں۔ انہیں اپنی بہو، حنا پر بڑا ناز تھا۔ خود مانگ کر لائی تھیں بھائی سے۔ حنا نے واقعی گھر سنبھال لیا تھا۔ حنا کی شادی سے،

ان کے میکے سے رشتہ داری ایک بار پھر نئی ہوگئی تھی۔ شروع شروع تو حنا انہیں پھوپھی آپا ہی کہتی تھی۔ لیکن شادمانی بیگم نے امی کہلوانا شروع کیا تو پھر حنا امی کہنے لگی تھی۔ شادمانی بیگم کو لگتا ان کے ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں۔ وہ دونوں میں کوئی فرق نہیں پاتیں، بلکہ حنا خدمت کے معاملے میں صبا سے بہت آگے تھی۔ روزانہ ان کے پاؤں دبانا، کھانے پینے کا خیال رکھنا، کپڑے دھلوا کر، پریس کروانا، اور ہمیشہ طبیعت کے بارے میں پوچھتے رہنا، حنا کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔

اسکول سے آنے اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سمیہ دادی کے پاس آگئی اور بولی۔

"دادی آپا! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔؟" پھر وہ اپنے ہاتھ جوڑ کر خدا سے دعا مانگنے لگی۔

"اے اللہ میاں، ہماری دادی کو ٹھیک کردے، ورنہ ہماری کہانی، بیچ میں رہ جائے گی۔"

شادمانی بیگم کو سمیہ پر بہت پیار آیا۔ انہوں نے سمیہ کو سینے سے بھینچ لیا، اور خوب پیار کیا۔ اللہ نے سمیہ کی دعا سن لی تھی۔ اور اس رات ایک بار محفل پھر جمی۔ بچے بڑے سبھوں نے شادمانی بیگم کو گھیر لیا تھا۔ اور حنا کے منع کرنے کے باوجود شادمانی بیگم، بچوں کی فرمائش اور اپنی کہانی سنانے کی خواہش کو دبا نہیں پائیں۔ ایک ادھوری کہانی پھر شروع ہوگئی۔

"ہاں تو بچو! میں کہہ رہی تھی کہ شہزادی ابھی پڑھ ہی رہی تھی کہ اس کے رشتے آنے لگے۔ پر شہزادی کے والدین ابھی تیار نہیں تھے۔ مگر جب شہزادہ کا رشتہ آیا تو سب نہ صرف تیار ہوگئے بلکہ بے انتہا خوش بھی۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ رشتہ منظور کر لیا گیا۔ شہزادی چودہ سال کی ہی تھیں کہ ان کی منگنی کی رسم ادا کردی گئی۔

کیا شاندار پروگرام منعقد ہوا۔ شہزادے کی بہنیں آئیں۔ حویلی کو خوب سجایا

گیا۔ دولت پور میں شہرت ہوگئی۔ شہزادی نے گہرے نیلے رنگ پر سنہرے رنگ کے کام والا بے حد دیدہ زیب لباس پہنا تھا۔ طلائی زیور خود پر رشک کر رہے تھے۔ ان کا حسن آنکھوں میں اترا جا رہا تھا۔ مانو دولت پور کے اندھیری زمین پر، آسمان سے چاند اتر آیا ہو۔ جو بھی دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ شہزادے کی بہنیں تو ان پر واری واری جا رہی تھیں۔ دولت پور کی میراثنیں، ڈھولک پر تال لینے لگیں۔ باہر بینڈ باجے کا شور، ادھر شہزادے کی کوٹھی میں رونق اور شادابی نے ہر طرف شامیانے لگا رکھے تھے۔ بجلی کے قمقمے، رنگ برنگی روشنیاں، آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہزاروں مہمان مدعو تھے۔ دولت پور کے ہر خاص و عام کی موجودگی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا لنگرِ عام ہو، جوق در جوق لوگ آ اور جا رہے تھے۔ شہزادے نے زردوزی والی سفید شیروانی پہنی تھی، جس میں ان کے مردانہ وقار میں اضافہ ہوگیا تھا۔ پورے دولت پور میں شہزادے اور شہزادی کی منگنی کی دھوم تھی۔

شہزادی اتنی خوبصورت لگ رہی تھی گویا ابھی ابھی پرستان سے اتری ہو۔ گھر کی بزرگ عورتوں نے انگلیاں چٹخا کر بلائیں لیں۔

"خدا آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔"

ہم عمر سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ کوئی کچھ کہتی تو کوئی کچھ۔۔

"او، شہزادے کی شہزادی۔۔۔ چاند کی چاندنی۔۔۔"

شہزادی، جب شہزادے کے بارے میں سوچتی تو اس کی آنکھیں جھک جاتیں۔ چہرے پر حیا کے رنگ محوِ سفر ہو جاتے۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شہزادہ اس کی قسمت میں ہوگا۔ ہاں تصور میں ضرور شہزادے کو بسا رکھا تھا۔ شہزادے کی شرافت، وضع داری اور اخلاق و اطوار کے قصے اس نے بہت سنے تھے۔ منگنی کے کچھ دن بعد، شاید عید کا موقع تھا۔ شہزادہ قمرالدین، شہزادی کے محلے میں آئے تھے۔ ان کے گھر بھی آگئے۔ وہ زنان خانے سے اپنی ہی دھن میں نکل رہی تھی کہ اچانک شہزادے سے سامنا ہوگیا۔

"ارے آپ! ہماری تو عید ہوگئی۔۔۔"

شہزادی نے سر نیچے جھکا لیا تھا۔ اس نے آج پہلی بار شہزادے کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اسے تو کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ تو شہزادے کے شرارت بھرے جملے پر چونکی۔

''حضور آپ تو واقعی عید کا چاند لگ رہی ہیں۔۔۔''

شہزادے کی حاضر جوابی کے بھی چرچے اس نے سنے تھے۔ وہ بھی کوئی کم نہیں تھی۔ اس نے سوچا جب قمر مخاطب ہے تو چاندنی کو بھی ساتھ دینا چاہیے۔

''جی! ویسے چاند تو آپ کے نام کا حصہ ہے''

شہزادہ کہاں ہار ماننے والا تھا۔ اس نے نہلے پر دہلہ مارتے ہوئے جواب دیا۔

''جی، ہاں اب وہ میری زندگی کا بھی حصہ بننے والا ہے۔''

اور شہزادی، شرم کے مارے سرخ ہو گئی تھی۔ کوئی جواب نہیں بن پڑا تو کمان سے نکلے تیر کی مانند واپس زنان خانے میں سما گئی۔

منگنی کے بعد شہزادی کے دل میں، شہزادے کی محبت روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر وقت شہزادے کا خیال، مستقبل کے منصوبے بناتے نکلتی کہ شہزادے کے ساتھ پہاڑوں پر گھومنے جائے گی۔ باہر ملکوں میں گھومے گی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب دونوں گھرانوں میں شادی کے شادیانے بجنے لگے۔ شادی کے وقت شہزادی عمر اٹھارہ سال کی ہی تھی جبکہ شہزادے خاصی پختہ عمر میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی عمر ستائیس اٹھائیس رہی ہوگی۔ سہیلیوں کے شہزادے کی عمر پر تبصرہ کرنے پر وہ کہتی۔

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا، مردوں کی عمر تو ان کی پختگی اور ذمہ دار ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔''

''بھئی کوئی ایک گلاس پانی پلا دو۔۔۔'' شادمانی بیگم کا گلا سوکھ رہا تھا۔ پانی پینے کے بعد انہوں نے کہانی پھر شروع کر دی۔

''شادی کا کیا بیان کروں۔۔؟ پورا دولت پور شادی کے جشن میں ڈوبا ہوا تھا۔ کئی کئی دن قبل سے دونوں طرف رسومات کا سلسلہ جاری تھا۔ عورتیں رات رات بھر شادی کے گیت گاتیں۔

''بنو تیرا جھومر لاکھ کا ری۔۔۔''

''بنو تیرا ٹیکہ ہے ہزاری۔۔۔''

''کونے میں کیوں بیٹھی لاڈو، آنگن میں پکار ہے۔۔۔''

''کار ہے دروازے کھڑی دولہا بھی تیار ہے۔۔۔''

کبھی ہلدی کی رسم ہو رہی ہے، تو کبھی مہندی لگائی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گانے بھی بدل رہے ہیں۔ فلمی گانوں پر جھوم جھوم کر ملازمائیں اور ان کی لڑکیاں، رقص کر رہی ہیں۔ عورتوں کا ہجوم ہے۔ زنان خانے میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے کاموں کے علاوہ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور عشق و معاشقے میں بھی کونے کھدروں کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ آخر بارات کا دن آ گیا۔ سید نسیم الدین کی حویلی اور آس پاس کی عمارتوں کو سجایا گیا تھا۔ ہر طرف روشنی کی چادر پھیلی ہوئی تھی، دن کا سا سماں تھا۔ بارات اور مہمانوں کے استقبال کا شاندار اہتمام کیا گیا تھا۔ مرکزی وزراء، ایم پی، ریاستی وزیر، ایم ایل اے، میئر، کمشنر، کے علاوہ پولس انتظامیہ اور سیاسی پارٹیوں کے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے اسٹال لگے تھے۔ ویج اور نان ویج کے علاحدہ الگ الگ۔ پھر خواتین کا انتظام بالکل الگ۔ کبابوں کے الگ اسٹال، آئس کریم الگ، میٹھے کئی اقسام کے۔ چائے کافی، چاٹ پکوڑی، بچوں کے کھانے اور کھیلنے کے سامان الگ، مشروبات کی تو بات ہی کیا؟ پنواڑی، خوشبودار پان کھلا رہے ہیں۔ شہنائی بجانے والے، اپنی دھنوں پر لوگوں کو مست کر رہے ہیں۔ اُدھر شہزادے کے گھر بارات کا اہتمام جاری ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، بگھی، رتھ، موٹر کار، سج دھج کے تیار ہیں۔ گولن دار، بارات کے آگے آگے گولے داغتے جاتے ہیں۔ بارات ایک طویل قافلے کی شکل میں جب سید نسیم الدین

کی حویلی پہنچی تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔

دو، رویہ قطاروں میں ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے لڑکوں نے بارات کا سلامی کرتے ہوئے استقبال کیا۔ ہر باراتی کو گلاب کا ایک پھول پیش کیا جاتا اور فضا میں خوشبو کے فوارے چھوڑے جاتے۔ وسیع وعریض احاطے، میں جس کے تین اطراف دالان تھے۔ درمیان میں شامیانے لگے تھے۔ بیچوں بیچ ایک اسٹیج بنایا گیا تھا۔ باراتیوں کے بیٹھنے کے لئے صوفے اور کرسیاں موجود تھیں۔ بارات کے نشست اختیار کرنے کے بعد مشروبات کا دور شروع ہوا۔ جو کافی دیر تک چلتا رہا۔ نکاح کا وقت آیا تو بڑی سادگی سے سارے مراحل پورے ہوئے۔ دونوں طرف کے لوگوں نے اپنی اپنی بندوقوں کا مظاہرہ کیا۔ فضا گولیوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر رخصتی کی تیاری ہوئی۔ رخصتی سے قبل دولہے میاں کو اندر زنان خانے میں سلامی کے لئے لے جایا گیا۔ عورتوں کے ہجوم میں شہزادے کو دیکھنے کی اور تحفے دینے کی ہوڑ سی لگی تھی۔ چلنے کو ہوئے تو پتہ چلا کہ جوتے چوری ہو گئے ہیں۔ شہزادی کی سالیاں آگئیں۔

"ہم تو بہت سارے پیسے لیں گے، تب جوتے دیں گے۔"

شہزادے کی حس مزاح بھڑک اٹھی۔

"ٹھیک ہے آپ جوتے رکھ لیں، ہم دوسرا جوڑا ابھی لائے ہیں۔"

اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے ساتھ آئے ملازمین سے دوسرا جوڑا لانے کو کہا۔

"چل ہٹ! یہ نہیں چلے گا۔۔" شہزادی کی پھوپھی زاد نے نوکر کو ڈانٹا۔

"پیسے نکالو۔۔۔ پورے دس ہزار لوں گی۔۔۔" پھر وہ شہزادے سے مطالبہ کرنے لگیں۔

"ذرا سا ریٹ کم ہو سکتا ہے۔۔؟"

"بالکل نہیں! ہم اتنی پیاری شہزادی جو دے رہے ہیں۔"

"چیک چلے گا۔۔" شہزادہ شرارت کا کوئی موقع گنواتا نہیں تھا۔

"شہزادی بھی ادھار رہی۔۔۔"

"اچھا بابا۔۔"

اور شہزادے نے روپے نکال کر دئے اور پھر جوتے ان کے قدموں میں آگئے۔

شہزادی کے لئے ایک بہت خوبصورت ڈولی کا انتظام کیا گیا تھا۔ کہاروں نے ڈولی اُٹھائی۔ شہزادی کی بہنیں آئیں اور شہزادی کو آخری بار ڈولی میں پانی پلا کر رخصت کیا۔ بارات دھوم دھام سے شہزادے کے محلے میں آئی تو یہاں شہزادی کے استقبال میں زمین و آسمان ایک کر دئے گئے۔ آتش بازی اور بندوقوں کے فائر ہوتے رہے اور شہزادی کو عورتوں کا ایک گروہ کوٹھی کے اندر لے کر چلا۔ شہزادہ بھی ساتھ تھا۔ اچانک شہزادے کی بہنوں نے راستہ روک لیا اور بولیں۔

"بھیا، پہلے ہمارا نیگ دو نہیں تو ہم اندر جانے نہیں دیں گے۔ راستہ بند......"

شہزادے نے اپنے گلے سے سونے کی چین اتاری اور نوٹوں کی ایک گڈی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجئے اب تو راستہ مل جائے گا۔"

اور اس طرح شہزادی کو ان کے کمرے تک پہنچا دیا گیا۔ کمرہ اس طرح سجایا گیا تھا کہ ہر طرف سے خوشبو کے جھونکے آرہے تھے۔ موتیا اور موگرا کے پھولوں کی لڑیاں الگ سماں پیش کر رہی تھیں۔ گلاب کے پھولوں کا رنگ اور خوشبو فرحت بخش رہی تھی۔ محلے کی عورتوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ہر عورت شہزادی کو دیکھ کر کہتی

"چاند کا ٹکڑا ہے۔ اللہ دونوں کو خوش رکھے۔"

منھ دکھائی میں زیورات اور پیسوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔

"ارے، ذرا پانی لاؤ، میرا تو حلق خشک ہو گیا۔" اچانک شہزادی بیگم رک گئی تھیں۔

کہانی نے سب کو مٹی کی مورتیوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ سب اتنے محو تھے کہ انہیں

یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ رات کے بارہ بج چکے ہیں۔

حنا نے پانی لاکر دیا۔ اور کہا

''امی اب بس کیجئے۔ پھر کل سن لیں گے۔''

''نہیں۔ نہیں۔ ہم تو آج ہی سنیں گے۔'' بچے مچل گئے۔

''نہیں چلو۔ صبح اسکول بھی جانا ہے۔ دیر سے سوؤ گے تو آنکھ نہیں کھلے گی'' اور بحالتِ مجبوری، مجلس برخواست ہوگئی۔ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ شادمانی بیگم نے بھی اللہ سے لو لگالی۔

''ہاں تو یہ ہوا کہ.....''

اگلے دن شادمانی بیگم نے کہانی کو یوں شروع کیا۔

حجلہ عروسی میں شہزادے اور شہزادی کا ملن ہوا۔ ایک طرف ٹیپ رکاڈر سے گانے بج رہے تھے۔ محمد رفیع کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

''دو ستاروں کا زمین پر ہے ملن آج کی رات.......''

واقعی آج دو ستاروں کا ملن تھا۔ دو بڑے گھرانوں کا ملن تھا۔ دولت پور کے لئے تاریخی دن تھا۔ پورے علاقے میں اس شادی کو لے کر خوب چرچے تھے۔ کوئی دعوت کا ذکر کرتا، تو کوئی بارات کی رونق کی بات کرتا۔ کسی کی زبان پر شہزادی اور شہزادے کی جوڑی کی تعریف....... ہر طرف خوشیوں کا رقص، جذبات اور امنگوں کے میلے، بہنوں اور ماں کے ارمانوں کی تعبیریں تھیں۔

وقت کا پرندہ، پرواز کرتا رہا، دولت پور دن بہ دن ترقی کرتا گیا، شہزادہ اور شہزادی میں اتنی محبت تھی کہ دوسروں کے لئے مثال تھی۔ شہزادہ ہر وقت شہزادی کا خیال رکھتا۔ جہاں شہزادی قدم رکھتی، شہزادہ اپنی پلکیں بچھا دیتا۔ شہزادی نے بھی اپنے حسن اور اخلاق و کردار

سے شہزادے کی والدہ اور ان کی بہنوں اور دیگر افراد کا دل جیت لیا تھا۔ دونوں نے مل کر شہزادے کی بھی بہنوں کی شادی کے فرائض بھی ادا کئے۔ شہزادی اور شہزادے کو خوشی سجدے کرتی رہی۔ ان کے دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بچے بہت خوبصورت تھے۔ شہزادے کے گھر رونق میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ ان سبھی خوشیوں کے لئے شہزادی کا احسان مند ہوتا کہ جب سے شہزادی نے اس گھر میں قدم رنجہ فرمائے ہیں گھر خوشیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔

دولت پور کے پاس کوئی ۲۰ کلومیٹر پر جہانگیر آباد تھا۔ شہزادے نے بچوں کی تعلیم کے سبب اپنی ایک رہائش شہر بنالی تھی۔ اب زمانہ بدل چکا تھا۔ پرانے اسکول کالج، واقعی پرانے ہو گئے تھے۔ اب انگریزی کا زمانہ تھا۔ انگلش میڈیم اسکولوں کا بول بالا تھا۔ شہزادے نے دونوں کا داخلہ کانوینٹ اسکول میں کرادیا۔

''پھر ایک دن وہ سیاہ رات آئی۔ جس کی سیاہی بہت خطرناک تھی۔ وہ رات، وہ رات....''

کہتے کہتے بیگم شادمانی کی آواز بند ہوگئی۔

''نانی.....نانی...... کیا ہوا۔''

ریحان نے آگے بڑھ کر نانی کی پیٹھ سہلائی۔ اور حنا جلدی سے ایک گلاس پانی لے آئی۔ پانی پی کر شادمانی بیگم تازہ دم ہوئیں۔ جذبات پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے کہانی کو جاری رکھا......

''وہ رات بہت خطرناک تھی۔ شہزادہ کھانا کھا کر چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہ اچانک انہیں دل کا شدید دورہ پڑا۔ کسی طرح سنبھل کر وہ وہیں بیٹھ گئے۔ انہیں گھر لایا گیا۔ ان کی حالت خراب ہو رہی تھی انہیں پسینہ آرہا تھا۔ ڈاکٹرز کو بلایا گیا۔ اسپتال کے ہارٹ سیکشن میں انہیں مصنوعی سانس پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ بجلی کے شاک سے بھی کام لیا گیا۔ مگر سب

بے سود ثابت ہوا۔ شہزادے کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔ اسپتال سے جب جسدِ خاکی لایا گیا۔ تو حویلی میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں تھی۔ ہر کوئی شہزادے کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ شہزادی کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ وہ اس اچانک افتاد سے ایسی ہو گئی گویا سانپ نے ڈس لیا ہو۔ آواز بند، چہرے کا رنگ زرد، آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی۔ انہیں کچھ بھی احساس نہیں تھا کہ کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے شہزادے کا جامد و ساکت جسم دیکھا، تو اچانک جیسے ندی پر لگا باندھ ٹوٹ گیا ہو۔ شہزادی نے دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ لوگ انہیں سنبھال رہے تھے مگر لوگوں کو کیا پتہ شہزادی کا کیا کھو گیا تھا۔ وہ تو تہی دامن ہو گئی تھی۔ بھیڑ میں تنہا کی مثال شہزادی پر فٹ ہو رہی تھی۔

اگلے دن جنازے میں ہزاروں کی بھیڑ۔۔۔۔ دولت پور میں ایسا جنازہ کبھی نہیں ہوا۔ جنازہ جب قصبے سے باہر نکلا تو دکاندار، ٹھیلے والے، کاریگر، مزدور، جوق در جوق جنازے میں شریک ہوتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا گویا دولت پور کی سب سے قیمتی دولت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو کر جا رہی ہے۔۔ دولت پور کے محلے ویران تھے۔ ہر طرف شہزادے کا ذکر، اس کے اخلاق و کردار کے تذکرے، مزدوروں، کام والوں، کی زبانوں پر ان کے احسانات کا بیان۔ ہر زبان پر یہی تھا۔

''بھیا ایسے تھے، بھیا ویسے تھے، بھیا نے ہمیں زندگی دی۔''

تین بہنوں کا بھائی، ماں کی آنکھوں کا اکیلا ٹمٹماتا چراغ..... اندھیرے سے لڑتے لڑتے، روشنی پھیلاتے پھیلاتے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ایک سورج کو گھنے سیاہ بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا۔

شادمانی بیگم کی آواز رندھ گئی تھی۔ بچے بھی رونے لگے تھے۔ صبا، ضیا، اور حنا کی بھی ہچکی بندھ گئی تھی۔

اچانک شادمانی بیگم نے زور کی ہچکی لی۔ اور وہ ایک طرف کو لڑھک گئیں۔

''امی !!!'' ضیا، حنا اور صبا ان کے بستر کی طرف لپکے۔

''دادی۔۔۔ دادی۔۔۔ نانی۔۔۔ نانی'' بچے بلک پڑے

فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹروں نے گردنیں جھکا لیں تھیں۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ قصہ گو خاموش ہو گیا تھا۔ کیسی کہانی؟ کہاں کے قصے سنانے والے؟ کیسے سامع؟ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بچوں کی چیخیں، عورتوں کی آہیں، کوٹھی انسانوں کے سمندر کی آماجگاہ بن گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

وقت دبے قدموں گذرتا رہا۔ دن، مہینے، اور مہینے سال تبدیل ہوتے رہے

سمیہ پہلے بیگم سمیہ اور پھر سمیہ دادی بن گئی تھی۔ اور اسے بچوں نے گھیر رکھا۔ اس نے کہانی شروع کی

''ایک تھی شہزادی.......''

''ہاں ایک تھی شہزادی، اس کا نام تھا شادمانی.......''

''سچی کہانی ہے یہ بچو! شادمانی بیگم کو ہم نے دیکھا تھا۔ ہم نے ان کے منہ سے کہانیاں سنی تھیں۔ لیکن ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ہماری دادی شادمانی بیگم ہی دراصل شہزادی تھیں۔ وہ اپنی اصل کہانی سنا رہی تھیں اور ہم شہزادے، شہزادی کی کہانی میں گم تھے۔''

سمیہ تھوڑی دیر کو رکی تو اس کے نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیاں ایک ساتھ بول پڑے۔

''پھر کیا ہوا۔۔۔؟''

''پھر یہ ہوا کہ شہزادے کے انتقال کا واقعہ سناتے سناتے شہزادی بھی اپنے شہزادے کے پاس چلی گئی۔۔۔''

''بچو چلو۔ سو جاؤ۔ آج کہانی یہیں ختم، باقی کہانی کل پوری کروں گی۔۔۔''

☆☆

عید گاہ سے واپسی

پریم چند کا ننھا حامد ستر سال کا بزرگ میاں حامد ہو گیا تھا۔ اسے اپنے بچپن کا ہر واقعہ یاد تھا۔ اُسے یہ بھی یاد تھا کہ وہ بچپن میں عید کی نماز کے لیے گیا تھا تو واپسی میں تین پیسے کا چمٹا خرید کر لایا تھا۔ اُس وقت اس کے دوستوں نے اس کا مذاق بنایا تھا۔ لیکن اس کے دوستوں کے خریدے کھلونے کے بعد دیگرے میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ اس کے چمٹے کی ایک ضرب نے سب کو بے کار کر دیا تھا۔ گھر آنے پر اس کی دادی پہلے اس سے ناراض ہوئی تھیں اور پھر اُسے خوب پیار کیا اور دعائیں دی تھیں۔ اس کے والدین بچپن ہی میں اللہ کے یہاں چلے گئے تھے، اُسے ان کی صورتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ بعد میں دادی نے اُسے غریبی، مجبوری، بے بسی اور لاچاری کے لقمے کھلا کھلا کر پالا تھا۔ اس کا بچپن دوسرے بچوں سے مختلف تھا۔ دونوں دادی پوتے ایک دوسرے کی کائنات تھے۔ اُسے وہ دن بھی یاد تھا جب قیامت صغریٰ نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ایک رات جب وہ سو رہا تھا۔ بہت تیز آندھی آئی تھی۔ ہوا اور پانی نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بہت سے پیڑ، پھوس کی چھتیں، کچی دیواریں اور جھونپڑے زمین سے اپنا رشتہ ختم کر چکے تھے۔ ایسے میں اس کی دادی جو گھر کے اسارے میں محو خواب تھیں، چھان گرنے سے دب کر اپنے بچوں کے پاس چلی گئی تھیں۔ وہ دادی دادی کرتا روتا رہ گیا تھا۔ گاؤں کے ہی لوگوں نے دفن وغیرہ کا انتظام

کیا تھا۔ وہ تقریباً پندرہ سال کا تھا۔ اس کا حال ایسا تھا گویا زندگی کی دوڑ میں تنہا رہ گیا ہو۔ اس کا اس بھری پری دنیا میں دادی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد پڑوس کے بابا سکھ دیو نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گئے اور اُسے اپنے بچے کی طرح پالا پوسا۔ گاؤں کے اسکول سے پانچویں تک پڑھنے کے بعد اُس نے پاس کے ایک چینی مل میں مزدوری کا کام شروع کر دیا تھا۔

"بابا...... بابا...... مجھے بیلون لینا ہے"

اس کے آٹھ سالہ پوتے ساجد نے ایک غبارے والے کو دیکھ کر اسے ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا تو وہ ماضی کے صحرا میں چلتے چلتے اچانک رک گیا تھا، ماضی کے واقعات بھی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے اکلوتے پوتے کے ساتھ عید گاہ جا رہا تھا۔ عیدیں تو ہر سال آتی رہتی ہیں اور ہر سال وہ عید کی نماز ادا کرتا تھا لیکن اس بار وہ اپنے پوتے کے ساتھ پہلی دفعہ عید گاہ جا رہا تھا۔

"بیٹا ابھی نہیں، واپسی پر لینا۔ ابھی نماز کے لیے جا رہے ہیں۔"

اس کے گاؤں سے عید گاہ تقریباً 5 کلومیٹر دور تھی۔ اس کا اپنا گاؤں ہندو اکثریتی گاؤں تھا وہاں مسجد نہیں تھی پاس کے گاؤں میں مسجد تھی۔ اکثر مسلمان جمعہ اور عید۔ بقرعید کی نمازوں کے لیے وہیں چلے جاتے تھے۔ حامد کو عید گاہ میں ہی عید کی نماز پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن کبھی موسم کی خرابی، کبھی وقت کی تنگی اور کبھی کام کی فراوانی کے باعث وہ ہر سال عید گاہ نہیں جا پاتا تھا۔ اس بار وہ کافی عرصے بعد عید گاہ کے لیے اپنے پوتے ساجد کے ہمراہ نکلا تھا۔ گاؤں سے نماز کے لیے ایک ٹولہ روانہ ہوا۔ کچھ نوجوان اسکوٹر اور بائک سے نکلے تھے۔ کچھ پیدل ہی چل رہے تھے۔ کتنی خوشی اور رونق تھی ان کے چہروں پر۔ واقعی عید اللہ کا انعام ہے۔ ایک ماہ کے روزے رکھنے کے بعد، عید کی خوشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اللہ مسلمانوں کی محنت، صبر، لگن اور للّٰہیت کے بدلے عید کے دن ان کے گناہ بخش دیتا ہے۔ میاں حامد نے رمضان کے پورے روزے رکھے تھے۔ گھر میں اس کی بہو بھی روزے کی

پابندی کرتی تھی۔ ایک پوتا اور ایک پوتی...... بس یہی کائنات تھی اس کی۔ بیٹا واحد..... گذشتہ دنوں ہونے والے ہندو مسلم فساد کی نذر ہو گیا تھا۔ بیٹے کی یاد آتے ہی اچانک ذہن کے ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ چار سال قبل، پس منظر کا حصہ بن چکے مناظر، یکے بعد دیگرے نظروں کے سامنے آنے لگے۔

ملک پر بڑا برا دن آیا تھا۔ سرخ آندھی اس بار شہروں سے اٹھی تھی جو شہروں، شہروں قصبات اور دیہات میں پھیل گئی تھی۔ ہندو مسلم منافرت..... ایک دوسرے کے خون کے پیاسے لوگ..... عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا جنون..... کیا عبادت گاہوں کی مسماری سے کوئی قوم ختم ہو جاتی ہے؟ یہ وہی ہندو مسلم تھے جنہوں نے شانے سے شانہ ملا کر ملک کو آزاد کرایا تھا۔ آج کیا ہو گیا ہے ان کو؟ کیوں ایک دوسرے کے قتل کے درپے ہیں۔ واحد بے چارہ ان حالات سے بے خبر تھا، اس نے تو گاؤں میں آنکھ کھولی تو اپنے بابا سکھ دیو، چاچا بلدیو اور اپنے ہم عمر دوست رام اور کنور پال کو دیکھا تھا۔ وہ تو انہیں کے درمیان کھیلا ہوا بڑا ہوا تھا۔ پاس کے ہی شہر میں وہ ایک بیکری میں مزدوری کا کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ اور گاؤں کی محنت مزدوری سے میاں حامد کسی طرح گھر چلا رہے تھے۔ شہر میں آنے والی سرخ آندھی نے بڑی تباہیاں مچائی تھیں۔ واحد بھی اس سرخ آندھی کی زد میں آ گیا تھا۔ اسے اس کے ہی ساتھیوں نے تہہ تیغ کر دیا تھا۔ غضب تو اس وقت ہوا جب واحد کی لاش گاؤں پہنچی۔

''میاں حامد...... میاں حامد..... واحد کی لاش..... آئی ہے'' بلدیو نے میاں حامد کو خبر دی تو اسے جیسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بلدیو کو پکڑ کر چلایا۔

''یہ کیا مذاق ہے۔''

ابھی وہ بلدیو کے کاندھوں کو پکڑ کر ہلا ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی دروازے پر رکی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور اسٹریچر پر واحد کی لاش لیے دو لوگ اندر داخل ہوئے۔ لاش کو چارپائی پر لٹا کر الٹے قدموں لوٹ گئے۔ کسی میں ان سے واحد کی موت کے بارے میں

پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ سارے گاؤں والوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ایک ایک کر کے سب کو پتہ چل گیا تھا کہ واحد کو شہر میں اس کے ساتھی مزدوروں نے کاٹ ڈالا تھا۔ گاؤں کے ہندو، خود کو واحد کا قاتل محسوس کر رہے تھے۔ میاں حامد کی حالت عجیب تھی، ان پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ لاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہے تھے۔ گویا انہیں امید ہو کہ واحد اب اٹھا اور تب اٹھا۔ اور اٹھتے ہی بابا کہتا ہوا ان سے لپٹ جائے گا۔ اچانک بہت زور سے چیختے ہوئے میاں حامد زمین پر بے سدھ گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔ واحد کی بیوی شکیلہ پر بھی بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ساجد اور ناز و اپنی ماں کے بے ہوش جسم سے لپٹے رو رہے تھے۔ بلدیو اور گاؤں کے پردھان ٹھاکر امر پال نے تدفین کا انتظام کیا۔ واحد کے جانے کے بعد سے میاں حامد کی حالت اس بوڑھے کی سی ہو گئی تھی جو لاغر ہو، کر جھکی ہو اور اس کی لاٹھی اس سے چھین لی گئی ہو۔ میاں حامد نے بچپن سے ہی بڑے نازک حالات دیکھے تھے۔ قحط پڑتا تھا تو کھانے کے لالے پڑ جاتے۔ مٹر، باجرہ، بے جھڑ اور جو کی روٹیاں بھی دن میں ایک وقت مل جاتیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے۔ گھر، گھر کیا تھا۔ بس ایک کمرہ اور اسارا تھا۔ کھیتی کی زمین نہیں تھی۔ اس کے باپ دادا نے بھی دوسروں کے یہاں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالا تھا اور ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ شروع میں بابا سکھ دیو کے گھر سے ہی اسے وقت بے وقت کھانا ملتا تھا بعد میں اس نے خود بھی کھانا بنانا شروع کر دیا تھا۔

''بابا..... او بابا..... وہ تتلی پکڑ دو نا......... کتنی اچھی ہے وہ''

ساجد کی آواز نے ایک بار پھر انہیں سوچ نگر کی گلیوں سے حقیقت آباد کے کچے راستوں پر لا دیا تھا۔ اس کا پوتا ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ تتلی کبھی ادھر کبھی ادھر جاتی، لیکن ساجد کے پہنچتے ہی اڑ جاتی۔ انہیں ایک پل کو لگا جیسے تتلی ان کی خوشی ہو، جو ہمیشہ اس سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے۔ لمحہ بھر کو لگتا کہ اب ہاتھ آئی..... اب آئی۔ لیکن پھر پھر سے اڑ جاتی۔ بے چارے ساجد کو کیا پتہ کہ یہ تتلی ہماری قسمت میں نہیں؟ ہماری قسمت میں تو

ہمیشہ کے دکھ ہیں جو سردی کی راتوں جیسے طویل ہوتے ہیں۔

"ساجد بیٹے۔نہیں۔تتلی کے پیچھے نہ بھاگو۔گر پڑو گے۔کپڑے خراب ہو جائیں گے۔"

کپڑے، کپڑے تو ساجد نے پہنے تھے مگر نئے نہیں تھے۔جبکہ ساجد نے پچھلے ہفتے ضد کی تھی۔

"بابا مجھے بھی نئے کپڑے سلوا دو نا، میں بھی حشمت کی طرح نئے کپڑوں میں عید گاہ جاؤں گا۔"

"اچھا بیٹا...لا دیں گے" بوڑھے حامد میاں نے مجبوراً کہا۔

اور انہوں نے ساجد کو پرانے کپڑوں کے ڈھیر میں سے ٹھیک ٹھاک سے کپڑے لا دیے تھے۔اتفاق سے چینی مل کے باہر پرانے سستے کپڑوں کا ایک ٹھیلہ عید کے سبب لگا تھا۔اس نے سرخ رنگ کی شرٹ اور نیلی پینٹ لے جا کر بہو کو دیے۔

"بہو انہیں دھو دینا۔اور تہہ کر کے نیچے رکھ کر اس پر پہلے پھونس پھر بستر بچھا دینا۔میں سو جاؤں گا۔کپڑوں پر استری ہو جائے گی۔"

بہو نے ایسا ہی کیا تھا۔ساجد کو ماں اور دادا نے بہلا لیا تھا۔چھوٹی نازو کی طبیعت خراب تھی اسے ماتا نکل آئی تھی۔وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ہر وقت روتی رہتی۔مکھیاں اسے پریشان کرتیں۔حامد مکھیوں کو دیکھ کر کئی بار سوچتا۔"اللہ نے مکھیاں کیوں پیدا کی ہیں۔یہ تو سب کو پریشان ہی کرتی ہیں۔" پر پھر خود ہی دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگتا کہ اللہ نے ہر چیز سوچ سمجھ کر ہی پیدا کی ہے۔

عید سے دو دن پہلے گاؤں کے حاجی لطیف ان کے پاس آئے تھے اور زکوۃ کے تین سو روپے دے گئے تھے۔انہوں نے کچھ پیسوں سے گھر کی ضروریات کو پورا کیا تھا۔ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ نازو کی بیماری اور گھر کے خرچے میں لگ جاتا تھا۔عید کے لیے پیسے کہاں سے آتے۔زکوۃ کے پیسوں سے انہیں کچھ راحت ملی تھی۔انہوں نے سوچا تھا کہ اب کی عید

پر وہ ساجد کو ریموٹ سے چلنے والی کار اور نازو کو پلک جھپکنے والی گڑیا خرید کر لائیں گے۔بہو جو جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھی' کے لیے ایک سوٹ لائیں گے۔عید گاہ جانے سے پہلے انہوں نے نہا کر اپنے پرانے دھلے کپڑے پہنے۔پھر ساجد کو تیار کیا۔ساجد کی ماں اسے عید گاہ بھیجنے کو تیار نہ تھی۔لیکن ساجد کی ضد اور میاں حامد کی مرضی کے آگے وہ مجبور ہو گئی تھی۔شوہر کی موت کے بعد اسے تو ہر وقت خدشہ لگا رہتا تھا کہیں اس کے بیٹے کو کچھ نہ ہو جائے۔گاؤں کے لوگ ساجد کو بہت پیار کرتے تھے، وہ تھا ہی بہت پیارا۔عید گاہ چلنے سے پہلے انہوں نے سویاں کھائیں۔پھر ایک ایک روپیہ سب کو عیدی کے دیے۔انہوں نے بلدیو کے بچوں کو بھی عیدی دی تھی۔وہ ہر سال ان کے بچوں کو عیدی دیا کرتے تھے۔ساجد نے اپنے اور نازو کے روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔گاؤں کے دس بارہ بڑے بوڑھوں، بچوں پر مشتمل یہ ٹولہ سفید کرتا پاجامے میں ملبوس سر پر ٹوپیاں لگائے عید گاہ کے لیے نکلا تھا۔عید گاہ تک جانے کے لیے تین گاؤں کو پار کرنا پڑتا تھا۔سردیوں کا زمانہ تھا۔راستے کے دونوں جانب ہری فصلیں لہلہا رہی تھیں۔گیہوں کے کھیتوں پر شباب کا رنگ تھا۔سرسوں پھول رہی تھی۔ہرے اور پیلے رنگ نے زمین کو اس کنواری دوشیزہ سا بنا دیا تھا جس نے سبز رنگ کے کپڑوں پر پیلا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہو، بلکہ ایسا بھی گمان ہو رہا تھا گویا قدرت زمین کے ہاتھ پیلے کرنے کی تیاری کر رہی ہو۔بگیا کے دونوں جانب فصلوں کی مہک دیوانہ بنا رہی تھی۔کہیں مٹر کے سفید اور جامنی پھول، کہیں ایکھ کے کھیت۔گاؤں میں ایک آدھ کولہو بھی نظر آ جاتا۔کولہو سے گڑ کی بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی۔ویسے اب زیادہ تر کسان شوگر ملوں میں ہی گنا ڈالتے تھے اور نقد روپے لے آتے۔اب گاؤں میں بھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔گاؤں کی نئی نسل کے بچے جب سے پڑھ لکھ گئے تھے اور کچھ نے باہر سروس شروع کر دی تھی گاؤں کا ماحول تبدیل ہونے لگا تھا۔اب وہ پہلے جیسی بے لوث محبت نہیں رہی تھی۔پہلے گاؤں کے کسی ایک شخص کا داماد سارے گاؤں کا داماد ہوتا تھا۔اس کی اتنی خاطر کی جاتی کہ وہ خاطر سے پریشان ہو جاتا تھا۔ہندو مسلم شیر و شکر کی طرح مل جل کر رہتے

تھے۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہونا، ایک دوسرے کے کام کروانا۔ چھان اٹھوانا، اکھیٔوانا، شادی بیاہ میں ہاتھ بٹانا ان کا معمول تھا۔

''میاں حامد.....میاں.....تنک ستائے لیو.....رس پی لیو۔ گرم گڑ کھالیو۔''

مُراد پور گاؤں کے کولہو والے بزرگ چاچا ایشور نے عیدگاہ جاتے قافلے کو روک لیا تھا۔ مُراد پور کے گاؤں کے مسلم بھی عیدگاہ جانے کو تیار تھے۔ جلدی جلدی قافلے کی خاطر کی گئی۔ قافلہ پھر آگے بڑھ گیا۔ حامد کو سکون ہوا کہ چلو ابھی بڑے بزرگوں میں کم از کم اتنی محبت اور خلوص تو باقی ہے۔ قافلہ اب پکی سڑک پر آ گیا تھا۔

میاں حامد نے اپنے پوتے ساجد کو کندھے پر بٹھا لیا تھا۔ قافلہ پکی سڑک کی ایک جانب قطار بنا کر چل رہا تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار بس قافلے کے نزدیک سے گذری۔ سب لوگ جلدی سے ایک طرف کو نہ ہو گئے ہوتے تو معاملہ خراب ہو سکتا تھا۔

''ابے اے کوڈ! کہاں جا رہے ہو.........؟''

موٹر سائکل پر سوار تین کم عمر اوباش قسم کے نوجوان، زور سے چلاتے ہوئے برق رفتاری سے گذر گئے۔ ننھا ساجد چونک گیا۔

''بابا یہ.....کوا کیا ہوتا ہے.....؟''

''کچھ نہیں بیٹا.......یہ گندے بچے تھے.......تم ایسے نہ بننا.....''

میاں حامد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ زمانہ کتنا بدل گیا تھا۔ بڑے چھوٹوں کا امتیاز ہی نہ رہا۔ بیٹے، باپ کے سامنے بیٹھتے بھی نہیں تھے۔ میاں بیوی کسی کی موجودگی میں ساتھ بیٹھنے سے بھی کتراتے تھے۔ بہو، ساس سسر کا احترام کرتی تھی۔ آج سب الٹ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب فلموں اور فیشن سے ہوا تھا۔ بچوں میں فلموں کا شوق دن بہ دن بڑھ رہا ہے۔ وہیں سے خرافات سیکھتے ہیں۔ فیشن اللہ توبہ! لڑکیاں بھی پتلون پہننے لگی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بازو کی قمیصیں۔ دوپٹا یا تو گلے میں پٹے کی صورت یا پھر ندارد۔ گاؤں بھی تبدیل ہو گئے تھے۔ کچے مکانوں کی جگہ پختہ اور بڑے مکان، موٹر سائیکلیں اور کاریں

اب اکثر دکھائی دیتیں۔ پہلے کسی کے گھر کار ہوتی تو اسے بڑا رئیس مانا جاتا، لوگ اس کی مثالیں دیتے تھے۔ گاؤں کو شاہراہوں سے ملانے والی پکی سڑکیں کھڑنجے یا تارکول کی بننے لگی تھیں۔ علاقے میں فیکٹریاں اور مل لگنے لگے تھے۔ ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانیت ختم ہوتی جا رہی تھی۔

''بابا عیدگاہ کب آئے گی.....؟''

''بس بیٹا.....وہ جو گاؤں دکھ رہا ہے نا.....بس اسی گاؤں میں ہے.....''

''بھئی ذرا جلدی چلو.....کہیں ایسا نہ ہو نماز چھوٹ جائے۔ رمضان کی ساری محنت ڈوب جائے گی۔''

میاں حامد نے قافلے کے بڑے، چھوٹوں، سب کو نصیحت کی۔ اور سب جلدی جلدی قدم بڑھانے لگے۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسلام پور کی سرحد میں داخل ہو گئے تھے۔ اسلام پور مسلم اکثریتی گاؤں تھا۔ عیدگاہ کے راستے پر دونوں طرف میلہ لگا تھا۔ ساجد تو بے چین ہوا جا رہا تھا۔ کہیں جھولے والے آواز لگا رہے تھے۔ کہیں غبارے دھاگوں سے بندھے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ گول گپے والے، چاٹ پکوڑی والے، چھولے کی چاٹ، دہی بڑے، بتاشے والے، مکا کی کھیلوں والے، کھلونوں کی تو بہت سی دکانیں تھیں، کسی دکان پر ہر مال پانچ روپے، کسی پر ہر مال دس روپے کا بورڈ لگا تھا۔ ساجد کی نظریں چاروں طرف بکھری بازار کی رونقوں کو دیکھ کر ہونق ہوئی جا رہی تھیں وہ سب کچھ خرید لینا چاہتا تھا۔

''بھیا آ جاؤ۔ جلدی آؤ.....نماز کھڑی ہونے والی ہے۔''

عیدگاہ سے کئی لوگ راستے میں آنے والوں کو پکار رہے تھے۔

قافلے نے لپک کر عیدگاہ میں قدم رکھا۔ عیدگاہ بہت بڑی نہیں تھی۔ مغرب کی طرف مسجد جیسی عمارت کی تقریباً بیس فٹ اونچی دیوار تھی جس میں کنگورے کٹے ہوئے تھے دیوار کے آخری سروں پر دو بلند مینار تھے۔ باقی دور تک خالی زمین جو سال میں دو نمازوں کے لیے اپنا دامن پھیلائے رہتی تھی۔ عید میں بہت بھیڑ ہوتی تھی۔ اسلام پور کے علاوہ آس

پاس کے گاؤں کے لوگ بھی یہیں نماز پڑھنے آتے تھے۔میاں حامد بچپن سے اب تک نجانے کتنی بار عید گاہ آئے تھے۔نماز کے بعد لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے تو ایسا لگتا گویا فرشتے زمین پر اتر آئے ہوں۔نماز کے بعد اسلام پور کے لوگ آس پاس کے لوگوں کو بغیر کچھ کھائے پیئے واپس جانے نہ دیتے میاں حامد کے ساتھ کئی بار بلدیو چاچا کے بچے بھی آجاتے تھے۔مسلمان نماز پڑھتے اور وہ سب کے جوتے چپلوں کی رکھوالی کرتے بعد میں عید گاہ میلے سے میاں حامد ان کے لیے کچھ نہ کچھ تحفے ضرور خریدتے۔وہ سب اپنے بھائی ہی تو تھے۔وہ سب میاں حامد سے چھوٹے تھے۔میاں حامد کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک بار بلدیو چاچا نے اپنی ٹریکٹر ٹرالی نکالی تھی اور گاؤں کے سارے مسلمانوں کو بھر کر عید گاہ لائے تھے۔کتنا میل ملاپ تھا لوگوں میں۔گاؤں میں امن وامان تھا۔گاؤں کے حالات سیاست سے بدلے تھے۔اب گاؤں میں بھی سیاست بڑھنے لگی تھی، پردھان اور گاؤں کے امیر لوگ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے۔رات کو موٹر چوری کرواتے، صبح کو ہمدردی جتانے پہنچ جاتے۔اور دو ایک دن بعد موٹر کہیں سے برآمد ہو جاتی۔اسی طرح بیل اور بھینس بھی غائب ہو جاتیں۔انہیں اچانک دس سال قبل کا وہ واقعہ یاد آگیا جب اس نے ایک رات بابا سکھ دیو کی بھینس چراتے مکھیا کے بڑے لڑکے کو دیکھ لیا تھا۔

”چور......چور......دیکھو بھینس لے جا رہا ہے۔چاچا...او بابا، بھیا......“

اس کی آواز پر بھینس کو بیچ میں چھوڑ کر چور فرار ہو گئے تھے۔مگر اس نے ایک چور کو پہچان لیا تھا۔اور غضب تو اس وقت ہو گیا جب اگلے دن پنچایت میں اس نے مکھیا کے بیٹے کا نام سب کے سامنے کہہ دیا۔مکھیا کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

”تم جھوٹ بولت ہو......میرا بیٹا نہیں کوئی اور ہوگا......“

”نہیں......نہیں......میں نے اپنی آنکھوں سے بیر پال کو دیکھا تھا......“

”پنچوں یہ مسلمان ہے......یہ ہندوؤں میں پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے......“

میاں حامد نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ بات اس کے کردار پر آجائے گی۔نفرت

اسلم جمشید پوری کے دیہی افسانے

کیا ہوتی ہے، اسے پتہ ہی نہ تھا۔اس نے تو کبھی کسی کو بری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔کیا ہندو، کیا مسلمان۔وہ تو بچپن سے ہی بابا سکھ دیو کے گھر رہ کر بڑا ہوا تھا۔انہوں نے ہی اس کی شادی کروائی تھی۔گاؤں کے کئی مسلمانوں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ سکھ دیو کے گھر نہ رہے لیکن اس نے کسی کی نہ سنی تھی۔پھر بابا اسے بیٹا ہی تو مانتے تھے۔ہمیشہ اس کے دکھ سکھ میں شریک رہتے۔مکھیا کے جملے نے تو جیسے میاں حامد کے سینے کو گرم سلاخوں سے داغ دیا تھا۔اس کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ گم سم ہو گیا۔مانوں اس کی زبان کاٹ دی گئی ہو۔لیکن اگلے ہی لمحے سکھ دیو اور ان کے خاندان والوں نے مکھیا اور اس کے بیٹے پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔دونوں طرف سے زوردار حملے ہو رہے تھے۔اس سے قبل کے کچھ انرتھ ہو جاتا، حامد میاں نے ایک زور کی چیخ ماری......

”بند کرو خدا کے لیے......!“

اور واقعی لڑائی کو اچانک بریک لگ گئے تھے۔

”تم لوگ میرے اوپر لڑ رہے ہو نا۔چلو میں گاؤں چھوڑ کر ہی چلا جاتا ہوں۔“

میاں حامد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، انہوں نے اپنا منہ دونوں ہتھیلیوں میں چھپا رکھا تھا۔ان کے اتنا کہتے ہی مکھیا اور بلدیو چاچا ایک ساتھ ان کی اور لپکے تھے۔

”نہیں حامد......تم گاؤں نہیں چھوڑو گے......“

اور پھر وہ ہوا جو گاؤں والوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔مکھیا نے اپنے بیٹے بیر پال کو سب کے سامنے مارنا شروع کر دیا۔

”اس کے کارن سب کچھ ہوا ہے......“

بڑی مشکل معاملہ رفع دفع ہوا تھا۔گاؤں میں حامد کی الگ پہچان تھی۔وہ ایک ایماندار مسلمان تھا۔جو جتنا مسلمانوں کا ہمدرد تھا اتنا ہی ہندوؤں کا بھی۔

”اللہ اکبر......“

امام صاحب نے نیت باندھ لی تھی سب نے دو رکعت نماز ادا کی۔خطبہ سنا اور دعا

مانگنے لگے۔ میاں حامد نے خدا کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے۔ ان کے لب تھرتھرا رہے تھے، ہاتھ بھی لرزنے لگے۔ ''اے خدا..... میرے خدا.... ہم بڑے گنہ گار ہیں۔ اے خدا ہمیں مسلمان کے ساتھ ساتھ انسان بھی بنا۔ مجھے انسانوں کی خدمت کرنا سکھا۔ یہ جو ایک عجیب قسم کی آندھی شہروں سے گاؤں کی طرف چلی آرہی ہے ہمیں اس سے محفوظ رکھ......''

دعا کے بعد سب ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ میاں حامد جھک کر اپنے پوتے ساجد سے گلے ملے۔ گلے ملتے وقت انہیں بے پناہ طمانیت اور مسرت کا احساس ہوا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ساجد کے اندر سرایت کر گئے ہیں۔ ایک چھوٹا بچہ بن گئے ہیں بچہ جو معصوم ہوتا ہے جو فرشتہ صفت ہوتا ہے۔

''بابا.... بابا..... آؤ نا کھلونا لیں گے.....''

ساجد نے ان کا ہاتھ کھینچا تو وہ دکانوں کی طرف چل دیے۔ ساجد نے بہت سے کھلونے دیکھے۔ سب کو فیل کرتا گیا۔ آخر میں اسے ریموٹ سے آگے پیچھے ہونے والی ایک خوبصرت سی کار پسند آگئی۔ ساجد نے ضد کرلی بابا میں تو اسے ہی لوں گا۔

''بھیا کتنے کی ہے.....؟''

''بابا پورے سو روپے کی''

''سو روپے.....؟'' میاں حامد کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی جیب میں کل ڈیڑھ سو روپے رکھے تھے۔ اگر وہ کھلونا خرید لیتے تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ لیکن وہ پوتے کا دل بھی نہ توڑنا چاہتے تھے۔ آخر کار ساجد کی ضد جیت گئی۔ مول بھاؤ کے بعد سودا پچاس روپے میں ہوگیا۔ پھر دونوں نے نازو کے لیے ایک آنکھیں مٹکاتی گڑیا خریدی، بابا سکھ دیو کے بچوں کے لیے بھی کھلونے اور دوسرا سامان خریدا۔ سامان لے کر وہ نکل ہی رہے تھے کہ اچانک گولیوں کے دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ دراصل اس بار عید اور کانوڑیا ترا آس پاس ہی تھے۔ سارے علاقے میں دہشت تھی۔ ہر طرف زعفرانی رنگ لہرا رہا تھا۔ پتہ چلا کہ کانوڑیوں کا

ایک جتھا اسلام پور سے گذر رہا تھا۔ ان پر کسی مسلمان نوجوان نے پتھر مار دیا تھا بس کیا تھا۔ کارسیوکوں نے مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ خبر پھیلتے ہی گاؤں کے مسلمانوں نے گولیاں چلانی شروع کردی تھیں۔ کارسیوکوں کی حمایت میں بھی بندوقوں نے گولیاں اگلنی شروع کردی تھیں۔ گولیوں کا نشانہ بن کر کئی لوگ لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔

میاں حامد نے ساجد کو گود میں اٹھا لیا اور ایک طرف کو بھاگنا شروع کر دیا۔ انہوں نے قافلے کے دوسرے لوگوں کو ادھر ادھر دیکھا بھی، لیکن وہ ایک لمحہ بھی انتظار میں گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ گاؤں کے حاجی شوکت نے حامد میاں کو اسلام پور میں ہی رکنے کو کہا۔ اسلام پور مسلمانوں کا بڑا گاؤں تھا۔ مگر حامد میاں نے منع کر دیا اور ایک طرف بھاگنے لگے۔ وہ بہت تیز دوڑ رہے تھے۔ ساجد کے ہاتھوں میں کار، گڑیا اور دوسرا سامان تھا۔ ننھے ساجد کو پتہ نہیں تھا اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ میاں حامد پکی سڑک تک آگئے تھے۔ ان کے بوڑھے قدموں میں نجانے کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ دراصل موت کا ڈر، خود ایک زبردست طاقت عطا کرتا ہے۔ ان کو ڈر تھا کہ اسلام پور کا معاملہ جب دوسرے گاؤں پہنچے گا تو ظلم ہو جائے گا۔ وہ اس لمحے کے آنے سے قبل ہی اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ سڑک پر پیچھے سے شور کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا ایک بھیڑ بے تحاشہ بھاگی آرہی تھی۔ لوگوں کے ہاتھوں میں تلواریں، لاٹھیاں اور بلّم تھے۔ انہوں نے سڑک سے کھیتوں میں بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ اب بس ایک گاؤں پار کرنا رہ گیا تھا، جس کے پار ان کا گاؤں تھا۔ دوڑتے دوڑتے وہ تھک گئے تھے۔ گاؤں کے ایک ویران پڑے ٹیوب ویل کے پاس وہ سانس لینے کو رکے۔ انہوں نے راستے سے خود کو چھپا لیا تھا تاکہ کوئی گذرے تو دیکھ نہ پائے۔

''بابا... کیا ہوا۔ آپ کیوں بھاگ رہے ہو.....؟''

''چپ..... پ....''

میاں حامد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہیں کوئی آواز نہ سن لے۔ اتنے میں

گاؤں میں زبردست دھماکہ ہوا۔ لگا جیسے کہیں کوئی بم پھٹا ہو۔ اسلام پور سے اٹھنے والی آندھی سرخ ہوتی جارہی تھی۔ موقع ملتے ہی چنگاری، شعلہ بن رہی تھی۔ آگ گاؤں گاؤں پھیلتی جارہی تھی۔ میاں حامد کے جسم میں خوف کا ناگ بری طرح لہرایا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنا راستہ تبدیل کیا۔ اب وہ گاؤں سے نہ گذر کر کھیتوں کھیتوں اپنے گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے وہ اپنے گاؤں کی سرحد میں داخل ہوگئے تھے۔ ساجد کو نیچے اتار کر انہوں نے ایک لمبی سانس لی۔ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا پر انہیں اطمینان ہوگیا تھا کہ اب وہ اپنے گاؤں میں آگئے ہیں وہ گاؤں جہاں ان کی اور ان کے باپ دادا کی عمریں گذری تھیں۔ وہ اطمینان سے ساجد کی انگلی پکڑے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ گاؤں میں داخل ہی ہوئے تھے کہ گاؤں سے ایک شور بلند ہوا۔

''مارو......پکڑو......''

اس سے قبل کے میاں حامد کچھ سمجھ پاتے ایک جتھا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ خون کی پیاسی تلواریں، قتل وغارت کا جنون اور دہشت پیدا کرنے والی آوازیں۔ انہوں نے پلک جھپکتے ہی ساجد کو اپنی گود میں اٹھالیا اور جیسے ہی ایک طرف کو بھاگنا چاہا کھیا کے بیٹے بیر پال کی دونالی سے نکلنے والی ایک بے رحم گولی نے ساجد کو نشانہ بنالیا۔

ساجد کے جسم کو پار کرتی ہوئی گولی میاں حامد کے سینے میں پیوست ہوگئی تھی۔ گولی نے اس طرح معصوم ساجد کا جسم پار کر کے میاں حامد کو زمین کا پیوند بنادیا تھا جیسے حرملہ کا تیر معصوم علی اصغر کے حلق سے ہوتا ہوا امام حسین کے بازو میں ترازو ہوگیا تھا۔ دونوں زمین پر آرہے۔ خون کا فوارہ دونوں جسموں سے بلند ہورہا تھا۔ زمین ساکت تھی۔ آسمان خاموش تھا۔ ہوا سانس لینا بھول گئی تھی۔ دونوں کے خون میں لت پت لاشے پڑے تھے اور تھوڑی ہی دوری پر ساجد کی کار، نازو کی گڑیا، بہو کا سوٹ، ایک دھوتی اور ایک چھوٹی سی پیتل کی لٹیا پڑی تھی، جو میاں حامد بابا سکھ دیو کے گھر والوں کے لیے لائے تھے۔

☆☆

بدلتا ہے رنگ.........

بہت تیز آواز کے ساتھ ایک گولا آسمان کی بلندیوں میں جا کر پھٹا۔ آسمان پر رنگ برنگے ستارے دائرے میں پھیل گئے گویا ستاروں سے سجی ایک بہت بڑی گیند آسمان پر لمحہ بھر کو ٹھہر گئی ہو۔

''ارے شرپھو! او شرپھو، دیکھ بارات آگئی ہے۔''

''ہاں سامو! گولے تو بڑے جاندار لگیے ہیں۔ کتنی جبردست آواج ہے اور کتنی لپٹ آکاس پر پھوٹی......؟

گاؤں کے دو کم عمر ہندو۔ مسلم دوستوں نے گاؤں میں بارات کی آمد کی خبر پاتے ہی، پہلے اپنی ٹولی اور پھر ٹولی نے سارے گاؤں میں خبر پھیلا دی، رام دین کی بیٹی آشا کی بارات آگئی ہے۔

گاؤں دھنورا، میں بارات آنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ ہزاروں باراتیں آچکی تھیں، ایک سے بڑھ کر ایک... کسی بارات میں گلاوٹھی کا مشہور بینڈ، کسی میں جہانگیر آباد کی نوٹنکی، کسی میں ہجڑے لاجواب، کسی میں گھوڑ سوار بینڈ باجے.... بارات کے گاؤں کی سرحد میں داخل ہوتے ہی، گولے داغ کر بارات کی آمد کی خبر دی جاتی۔ گاؤں کے لوگ جو کئی دن سے بارات کی آمد کی راہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، گولے کی آواز پر بزرگوں اور نوجوانوں کا

ایک گروہ بارات کو لینے کے لیے، گاؤں کے باہر جاتا ہے۔

''ارے رام دین! بابا اسماعیل کہاں ہیں؟ بارات کی اگوائی کو انہیں لے چلو، اُن سُو بُو دتو کوئی اور نہ دیکھے ہے۔''

''ہاں..... ہاں..... کا کا بلدیو، اسماعیل بابا کو اور ان کو بھی لے لیو۔''

بابا اسماعیل، کا کا بلدیو، ترکھا بابا، رام پال سنگھ فوجی، آشا رام تیاگی، شیخ نثار احمد اور نوجوانوں کا ایک ٹولہ بارات کے استقبال کے لیے روانہ ہوا۔

گاؤں کے باہر بارات کے لوگوں سے ہاتھ ملائے گئے۔ بابا اسماعیل سب سے بڑے تھے، انہوں نے شگن کے سوا روپے رام دین کے سمدھی، مہندر سنگھ کے ہاتھوں میں رکھے اور بولے۔

''آجاؤ بھئی۔ گام میں آپ کو، سواگت ہے.....''

ایک ساتھ کئی گولے آسمان کو آواز اور روشنی سے چیرتے چلے گئے۔ کچھ نے کانوں میں انگلیاں دے لیں تو کچھ نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ بارات سج چکی تھی۔ آگے آگے سروں پر ہنڈوں کو لیے دو طرفہ قطار میں مزدور مرد۔ عورت، ان کے پیچھے ڈھول تاشے لیے باجے والے، ان کے پیچھے نوجوانوں کی ڈانس کرتی ٹولی..... جس کے پیچھے آر کے شرما بینڈ پر آواز کے ساتھ ناچتے گاتے نوجوان...... ان کے پیچھے لڑکیوں کی ناچتی ہوئی دو جوڑیاں..... سب جانتے تھے کہ یہ لڑکیاں تو بس نقلی ہیں، اصل میں یہ لڑکے ہوتے تھے جو لڑکیوں کا بھیس بدل کر خوب ناچتے اور نوٹ بٹورتے تھے۔ ان کے پیچھے ایک بڑی بگھی میں دولہے راجا اور ان کی بغل میں ان کا پیارا سا کم عمر بھانجا...... سب سے پیچھے بزرگ.... گانوں، باجوں، ناچ کھیل کے ساتھ بارات دھوم دھام سے سارے گاؤں کی گلیوں سے گذرتی رہی۔ چھتوں پر لڑکیاں اور عورتیں ایک کے اوپر ایک، بارات کی دھوم دھام اور دولہے کو دیکھنے کے لیے بے تاب کھڑی تھیں۔

شام کو گاؤں میں داخل ہونے والی بارات گھنٹوں گاؤں کی گلیوں اور چوراہوں

سے گذرتی ہوئی اسکول کے احاطے میں آ گئی تھی۔ جہاں پہلے ہی سے پچاسوں چار پائیاں (جو گاؤں کے ایک ایک گھر سے جمع کی گئی تھیں)، اُن پر گاؤں کے گھروں سے اکٹھا کی گئی چوتئی اور دوتئی بچھائی گئی تھیں۔ بیچ میں بڑے سے حصے میں زمین پر کپڑے بچھائے گئے تھے۔ اسکول میں داخل ہوتے ہی بارات کے گانے، ڈھول تاشے سب اچانک بند ہو گئے تھے گویا بجلی ٹرانسفارمر جل گیا ہو۔ سر پر سے ماتو شور کی ایک چادر سی اتر گئی تھی۔ اسکول کے احاطے میں آتے ہی سب نے لپک کر چار پائیاں ہتھیا لی تھیں۔ بزرگوں نے خود کو ایک طرف کر لیا تھا۔ حقہ بجانے والے آمنے سامنے کی چار پائیوں پر قبضہ جما چکے تھے۔ چار پائیوں کے درمیان میں حقے رکھے تھے، جو تازہ دم بھی تھے اور چلم میں سلگتی ہوئی آگ بھی۔ جنہیں چار پائی نہیں ملی وہ بیچ کے حصے میں زمین پر پسر گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بالٹیوں اور گلاسوں کے ساتھ لڑکوں کا ایک ٹولہ آیا۔ کسی بالٹی میں دودھ، کسی میں پانی اور کسی میں دودھ۔ روح افزا کا شربت، بارات کا سواگت ہو رہا ہے۔ اپنی اپنی پسند کے مشروب پیے جا رہے ہیں۔ حقے کی گڑگڑاہٹ اور دھوئیں کے ننھے ننھے بادل ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے۔

''یہ کون نا ہنجار ہے جو دھنورہ میں بارات لے کر آیا ہے۔''

ایک تیز چیختی ہوئی آواز نے خاموشی کے چہرے پر طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ باراتیوں نے دیکھا ایک پولس والا، خاکی وردی میں ملبوس، شانے پر تھری اسٹار، سر پر خوبصورت سی کیپ، کمر میں روالور کی پٹی اور ہاتھ میں چمچماتی ہوئی بیت .... چھ فٹ کا دراز قد، خوبرو نوجوان، اپنے ہاتھ کی اسٹک کو گھماتا ہوا دولہے کے باپ کو تلاش کر رہا تھا۔

''کون ہے بھئی مہندر سنگھ........'' تم نے کس کی آ گیا سے دھنورہ گاؤں میں گولے داغے۔''

اپنی اسٹک گھماتا ہوا وہ چار پائیوں کے ادھر اُدھر غضبناک نظروں سے ایک ایک چہرے کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چھوٹے بچوں کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ان کی گھگھی بندھ گئی تھی...... کسی ایک نے مہندر سنگھ کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا... پولس والا لپکا۔ اسٹک کو

چارپائی پر مارتا ہوا دہاڑا۔

''ہاں بے سمدھی، بتا بارات نے گولے کیوں داغے۔''

''حضور غلطی ہوگئی۔ معاف کر دیو۔'' سمدھی نے گھبرا کر معافی مانگ لی۔

''کوئی معافی وافی نہیں۔ جرمانہ بھرو......لاؤ دوسو روپے نکالو۔''

مہندر سنگھ نے دھوتی کی انٹی میں رکھے روپے نکالے اور گن کر پولس والے کے حوالے کر دیے۔

''ٹھیک ہے بھئی سمدھی، اب پٹاخے چھوڑ سکتے ہو......''

پولس والا پاؤں پٹختا ہوا، اسکول سے باہر چلا گیا۔

اتنے میں گاؤں کے لڑکوں کی ایک ٹولی آئی۔

''آہا......بن گئے۔ اُلّو، ارے وہ کوئی پولس والا نہ تھا وہ تو اپنا جفرو تھا۔ ہاہا......ہا......'' ٹولی چلی گئی تھی۔ باراتی خود کو لٹا ہوا محسوس کر رہے تھے گویا کسی نے سارے باراتیوں کی جیب پر ہاتھ صاف کر دیے ہوں۔

ظفر الدین، گاؤں دھنورا میں آباد شیخ خاندان کا ایک لڑکا تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ اُسے جفرو (ظفرو) کہتے تھے۔ ظفر الدین نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اس نے اپنے باپ فقرو (فخر الدین) کو دو کام کرتے دیکھا تھا۔ ایک تو وہ پورے گاؤں کے حقوں کے نیچے باندھنے کا کام کرتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے نیچے بہت خوبصورت ہوتے تھے۔ وہ حقے کی ساخت اور سائز کے مطابق نیچے تیار کرتے تھے۔ پہلے ایک پتلے بانس کی نلکی کو دوسرے سے جوڑتے، ایک نلکی جس پر چلم رکھی جاتی اس کی گردن موٹی ہوتی تھی۔ دوسری نلکی حقہ پینے والے کے منہ کی طرف جاتی تھی، وہ اتنی لمبی ہوتی تھی کہ چارپائی پر بیٹھ کر آسانی سے حقہ گڑگڑایا جا سکے۔ دونوں نلکیوں کا میل حقے کی فرشی میں ہوتا تھا۔ نلکی کے اوپر رنگ برنگے کپڑے لپیٹے جاتے اور پھر ریشم کے خوبصورت دھاگوں سے کپڑے کو سختی سے باندھا جاتا۔ فقرو کے بندھے نیچے کئی بار انعام جیت چکے تھے۔ اس کے والد کا دوسرا کام 'بہروپیے' کا تھا۔ وہ شادیوں،

سوانگ، نوٹنکی وغیرہ میں مختلف بھیس بدل بدل کر بہروپیے کا رول کرتے تھے۔ ان دو کاموں سے ہی فقرو نے آٹھ آٹھ اولادوں کو پالا تھا۔ ظفرو بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اُس نے اپنے والد سے بہروپیے کا ہنر سیکھا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ گھبرا جاتا تھا۔ آواز ساتھ نہیں دیتی تھی۔ جب پہلی بار اس کے والد نے اُسے شرابی کے بھیس میں گھر پر ہی رول کروایا تو وہ بیچ میں ہی اٹک گیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے بولنے کی خوب مشق کی تھی۔ اب وہ کسی بھی جلسے میں تابڑ توڑ بول سکتا تھا۔ ابھی پچھلے ماہ اس نے ایک نوٹنکی میں جوکر کا کردار ادا کیا تھا۔

''حضور، حضرات، مہربان، قدر دان، بندہ آپ کو آداب بجا لاتا ہے۔ میں ایک جوکر ہوں، جو، کر یعنی، جو کہتا ہوں، کرتا ہوں، جی ہاں......میں آپ کو اپنی اصلیت بتاتا ہوں۔ میں ایک بہت بڑا رئیس ہوں۔ میرے گھر پر تین ہزار چھپکلیاں، دو ہزار مینڈکیاں، ایک ہزار چوہیاں، دو دودھ کی نہریں بہاتی ہیں۔ نہر میں ہزاروں مچھر اور مکھیاں ڈبکیاں لگا لگا کر نہاتے ہیں لیکن دودھ پھر بھی صاف رہتا ہے۔ دروازے پر لاکھوں مچھر پہرہ دیتے ہیں، مجال ہے جو کوئی بھی مکڑی یا مکڑا گھر کے اندر داخل ہو جائے.........'' تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور واہ واہی کے درمیان وہ اسٹیج سے اتر آیا تھا۔ لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے......ایک تو اس کا لباس، گویا بانس پر کپڑے ٹانگ دیے ہوں، دوسرے اس کا تیز ترین رفتار سے بولنا، سارا گاؤں، بلکہ آس پاس کے علاقے میں اس کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ اب اُسے کام بھی خوب ملنے لگا تھا۔ گاؤں میں آنے والی باراتوں میں تو وہ کسی نہ کسی بھیس میں ضرور جاتا تھا اور اپنا ہنر دکھا کر خوب پیسے بٹورتا......وہ اپنے والد کا نام روشن کرنا چاہتا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو پڑھانا چاہتا تھا۔ وہ خود تو بالکل نہیں پڑھ پایا تھا، بس تقریر کی مشق نے اُسے مختلف لب و لہجے میں بولنے میں مہارت عطا کر دی تھی، جو اس کا ذریعہ معاش تھا۔ وہ اپنے کام سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا تھا۔ دور دراز کے گاؤں سے اُسے نیوتا آتا تو وہ ضرور جاتا۔ ایک دن گاؤں میں ایک سیاسی لیڈر کا جلسہ تھا۔ پارٹی کے لوگوں نے ظفرو کو پہلے ہی خبر کر دی تھی۔ انہیں بھیڑ جٹانے سے مطلب تھا۔ ظفرو کو پیسے چاہیے

تھے۔ اُس نے عام دنوں سے زیادہ پیسوں کی مانگ کی تھی، جسے منظور کر لیا گیا تھا۔

گاؤں کی چوپال پر اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے کچھ چارپائیاں پڑی تھیں۔ سامنے دری بچھی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ آنے لگے تھے..... اچانک اسٹیج پر ظفرو نمودار ہوا۔ آج اُس نے قصہ گو چور کا روپ دھارا تھا۔

ڈھول کی تھاپ کے ساتھ ظفرو اسٹیج پر وارد ہوا۔ تالیوں سے استقبال کیا گیا۔ اس کا حلیہ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے سفید دھوتی کے اوپر لال شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر منڈاسہ، بڑی بڑی مونچھیں اور پیر میں دو پٹی کی چپل...

"ہاں تو میرے مہربان، قدردان بھائیو اور بہنو........ لو میں تمہیں ایک قصہ سنا تاہوں.........."

لوگوں کی بھیڑ ظفرو کو سننے کے لیے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ظفرو اسٹیج پر تھا اور سامنے سینکڑوں لوگ بیٹھے تھے۔ لڑکوں کا ٹولہ الگ، بڑے بوڑھوں کا گروہ الگ، لڑکیوں اور عورتوں کی ٹولی الگ۔ سب کی نظریں ظفرو کی حرکات پر تھیں۔

"ایک دفعہ میں ایک شکار پر گیا۔ گھنا جنگل اور میں اکیلا۔ شائیں شائیں کرتی ہوا۔ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ دل میں دہشت پیدا کر رہی تھی۔ شام کا وقت ہو چلا تھا اچانک پاس کی جھاڑیوں میں حرکت ہوئی، میں فوراً پیچھے گھوما (یہ کہتے ہوئے وہ اچانک پیچھے کی جانب گھوم گیا) ڈر کا جھونکا مجمع پر اِدھر سے اُدھر گذر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک خوبصورت ہرن، قلانچیں بھرتا دور کو بھاگ رہا ہے۔ میں نے ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔"

قصہ سناتے سناتے وہ اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ ٹہلتا ٹہلتا وہ لوگوں کے درمیان جا پہنچا.....

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا برق رفتار ہو گیا تھا، لیکن ہرن گھوڑے سے خاصا آگے دوڑ رہا تھا..... دوڑتے دوڑتے...... اچانک ہرن کو ٹھوکر لگی..... وہ گر پڑا، میں اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ ہرن کے قریب پہنچا تو

دیکھا ہرن زخمی ہوا پڑا ہے۔ میں گھوڑے سے اترا، گھوڑے کو چھوڑا۔ آہستہ آہستہ دبے قدموں، ہرن کی طرف بڑھنے لگا۔" پورے مجمع پر سناٹا طاری تھا۔ ظفرو ان کے درمیان آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا فلم کا کوئی منظر نظروں کے سامنے زندہ ہو گیا ہو۔

"ارے یہ کیا۔ میں نے دیکھا ہرن اچانک غائب ہو گیا تھا۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ آس پاس سے عجیب و غریب آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے جسم پر خوف کے کانٹے اُگ آئے تھے۔ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ پیچھے گھومنے کی ہمت نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے پیچھے دیکھا تو میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا، میرا گھوڑا بھی غائب تھا........"

قصہ گو سے اُٹھنے والی ڈر کی لہروں نے سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ سارا مجمع مانوں پتھر کے بتوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ سب نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ظفرو نے خاموشی اور سناٹے کا فائدہ اُٹھا کر کئی لوگوں کی گھڑیاں اور دوسرے قیمتی سامان صاف کر دیے تھے۔

"لو قصہ ختم......." ظفرو نے زور سے آواز لگائی۔ آنکھوں نے دیکھا ظفرو اسٹیج پر چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چرایا گیا سامان تھا۔ لوگ حیران تھے۔ انہیں علم ہی نہیں ہوا کب ظفرو نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی۔ ظفرو نے سب کا سامان واپس کر دیا۔ لوگ اپنی مرضی اور خوشی سے ظفرو پر پیسوں کی بارش کر رہے تھے۔ ادھر نیتاجی کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی آ گئی۔

وقت گذرتا رہا۔ ظفرو کی شادی ہو گئی تھی۔ اس کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ بہن بھائیوں کی بھی شادی کسی طرح ظفرو نے کر دی تھی۔ ظفرو کی بیوی نوری نے دو خوبصورت جڑواں بیٹے پیدا کیے۔ دونوں بہت خوبصورت تھے۔ ظفرو اپنی بیوی، بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ کمانا چاہتا تھا۔ اس نے سرکس اور میلوں میں بھی اپنے کرتب دکھانے شروع کر دیے تھے۔

ظفرو نے میلے میں اپنا شو شروع کیا۔

اس نے ڈکیتوں کے ایک گروہ کا منظر پیش کیا تھا۔ وہ خود گبر سنگھ بنا تھا۔ اپنے کئی دوستوں کو ڈکیت ساتھی بنایا تھا۔ سارے گروپ کا بہروپ ڈکیتوں جیسا بنانے پر ظفرو نے

خاصی محنت کی تھی۔ اس نے لکڑیوں کی بندوقیں اور گولیوں کی پیٹی بنوائی تھی۔ اُس نے اسٹیج پر ٹہلنا شروع کیا۔ فوجی بیلٹ کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ گرج رہا تھا۔

’’سور کے بچو! سوچا تھا سردار سباشی دے گا۔ سارا نام مٹی میں ملائے دیو... تمہیں سزا ملے گی... ضرور ملے گی۔‘‘

’’سرکار ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔‘‘

’’تو اب گولیاں کھاؤ.........‘‘

ظفرو نے اپنے نقلی روالور سے گولی داغی۔ گولی کی آواز، دھماکہ بن کر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ تالیاں بجا رہے تھے، اُچھل رہے تھے۔ عین اُسی وقت میلے میں ایک اور دھماکہ ہوا۔ شہر کی معروف ہستی حاجی سبحان کو گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ پورے میلے میں بھگدڑ مچ گئی، جس کا سر جہاں سما رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔ کہاں کا اسٹیج، کہاں کا گبر۔ کھیل دکھانے والے رہے نہ دیکھنے والے۔ میلے میں دہشت پھیل گئی۔ پولس نے میلوں کے راستوں پر پہرہ سخت کر دیا۔ دھر پکڑ اور گرفتاری میں ظفرو پولس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس نے بہت منت سماجت کی کہ وہ تو تماشہ دکھا رہا تھا۔ گبر کا رول کر رہا تھا۔ لیکن پولس نے ایک نہ سنی۔ ظفرو کا ڈکیتوں والا لباس، روالور اور گولیاں ثبوت کے لیے کافی تھے۔

اگلے دن اخبارات کی سرخیاں تھیں۔

’’پاکستانی دہشت گرد ظفر گرفتار۔‘‘

’’حاجی سبحان کا قتل کرنے والا پاکستانی گرفتار۔‘‘

’’آئی ایس آئی کے ایجنٹ کی گرفتاری، میلے میں فائرنگ کر شہر میں فساد کرانے کا منصوبہ تھا۔‘‘

پولس ریمانڈ میں ظفرو کو جو اذیتیں دی گئیں، ان سے مزید نہ گذرنے کے لیے اُس نے اقبال جرم کر لیا تھا کہ زندگی کے نجانے کتنے روپ ہیں اور ابھی اُسے کتنے بہروپ اختیار کرنے ہیں، اُسے پتہ نہیں تھا۔

☆☆

مرتب کا تعارف

نام	:	محمد فرقان
قلمی نام	:	انجینئر محمد فرقان سنبھلی
تاریخ پیدائش	:	20، جون 1973
ولدیت	:	مرحوم محمد غفران
پتہ	:	محلہ دیپا سرائے چوک سنبھل ضلع سنبھل (یوپی) Pin- 244302 Email id - f.sambhli@gmail.com mfurqan.rs@amu.ac.in Website - www.f.sambhli.weebly.com Mobile - 09568860786
تعلیم	:	ایم اے (اردو)، نیٹ (NET)، ڈپلومہ سول انجینئرنگ
مشغلہ	:	صحافت (روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو) مدیر (ہفت وار قومی فکر او روقار)، مدیر (ویب میگزین مشعل)
مطبوعہ کتب	:	(۱) مصر قدیم (2003)، (۲) آئینۂ فلکیات (2004) (۳) اردو صحافت اور ضلع مرادآباد (2008) (۴) آبِ حیات (افسانوی مجموعہ) (2010) (۵) نقوش قلم (مجموعہ مضامین) (2013) (۶) ترک اور سرکار سنبھل (ترجمہ) (2013)

زیر ترتیب : (۱) طوطامینا کی قبر (آثار قدیمہ)
(۲) مسلم معاشرہ میں لوک گیتوں کی روایت

زیر طباعت (۱) طلسم (افسانوی مجموعہ)

انعامات و اعزازات : (۱) اتر پردیش اردو اکادمی (2008 & 2005)
(۲) بہار اردو اکادمی (2005 & 2010)
(۳) سرسوتی ایوارڈ (2005)
(۴) یووا لیکھک ایوارڈ (2007)
(۵) مرحوم عبدالرحمٰن، بجنوری ایوارڈ ضلع بجنور (2011)
(۶) مانو ادھیکار جن نگرانی کمیٹی اور شہر کانگریس سنبھل
(۷) اتر پردیش سامنیا گیان پرتیوگیتا کمیٹی ایوارڈ
(۸) بہار اردو اکادمی کا اختر اورینوی ایوارڈ (2010) وغیرہ

مقالات و مضامین : فکر و نظر (علی گڑھ)، تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)،
عالمی سہارا (دہلی)، ضیاء وجیہ
: رہنمائے تعلیم (دہلی)، صوت القرآن (گجرات)،
خبر دار جدید (النور رامپور)،
سمت (انٹرنیٹ میگزین) وغیرہ کے ساتھ ساتھ روز نامہ
سہارا اردو،
صحافت، ہمارا سماج وغیرہ اخبارات میں تقریباً 300 سے زائد
مقالے، مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ہنوز جاری ہیں۔

تبصرے : (۱) کتاب سلطان الشہد امصنف انجینئر سمیع الدین
(شائع ضیاء وجیہ ماہنامہ)
(۲) علی جواد زیدی شخص اور شاعر مصنف ڈاکٹر عابد حسین حیدری
(شائع صحافت)

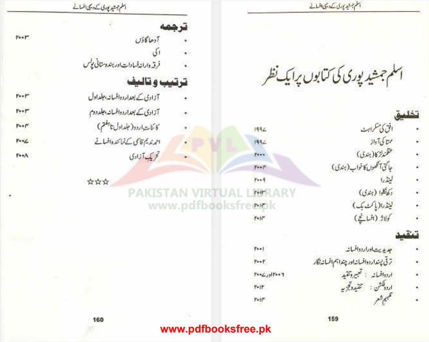
(۳) جعفر ساہنی کے شعری مجموعہ "شاید" پر تبصرہ "روح ادب" بنگال میں
(۴) "غالب اور بدایوں" کتاب پر تبصرہ "غالب نامہ" میں وغیرہ

مقالات برائے سیمینار : انٹرنیشنل۔(۱) چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی میرٹھ
(اردو افسانہ 1985 کے بعد)
(۲) ڈاکٹر بی آر امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ (آگرہ فارسی مآخذ میں)
(۳) مرکز تحقیقات فارسی اے ایم یو علی گڑھ
(داستان گوئی ادبیات فارسی)
(۴) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (صوفی ازم)
(۵) مرکز تحقیقات اے ایم یو علی گڑھ (تذکرہ نویسی)
(۶) رامپور رضا لائبریری رامپور (تاریخی و تہذیبی ماخذ)
نیشنل۔(۱) میرٹھ، الہ آباد، علی گڑھ یونیورسٹیز کے ساتھ ساتھ
مراد آباد، سنبھل،
آگرہ، رامپور وغیرہ میں تقریباً ۴۲ سیمینار میں مقالے پیش کئے۔

کانفرنس رورکشاپ : (۱) عالمی اردو کانفرنس آندھرا بھون دہلی
(۲) میڈیا اور مسلمان ورکشاپ، مرزا غالب ریسرچ اکادمی آگرہ
(۳) آر ٹی آئی قانون، زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا رامپور
ان کے علاوہ بھی کئی شہروں میں کانفرنس ورکشاپ میں شرکت

تنظیم راداروں سے وابستگی: (۱) نائب صدر منتظمہ کمیٹی عاشق پبلک لائبریری، سنبھل
(۲) جنرل سکریٹری ڈاکٹر عندلیب شادانی میموریل اکادمی، سنبھل
(۳) جنرل سکریٹری مصور سبزواری ادبی سوسائٹی، سنبھل
(۴) سینئر نائب صدر پترکار سنگھ ضلع سنبھل
(۵) صدر ریڈیو پیراڈائز لسنرس کلب، سنبھل

☆☆



اسلم جمشید پوری کی کتابوں پر ایک نظر

تخلیق

- افق کی مسکراہٹ ۱۹۹۷
- ممتا کی آواز ۱۹۹۷
- عقلمند لڑکا (ہندی) ۲۰۰۰
- جاگتی آنکھوں کا خواب (ہندی) ۲۰۰۴
- لینڈرا ۲۰۰۹
- دکھ نگلوا (ہندی) ۲۰۱۳
- لینڈرا (پاکٹ بک) ۲۰۱۳
- کولاژ (افسانچے) ۲۰۱۴

تنقید

- جدیدیت اور اردو افسانہ ۲۰۰۱
- ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار ۲۰۰۲
- اردو افسانہ : تعبیر و تنقید ۲۰۰۶ اور ۲۰۰۷
- اردو فکشن : تنقید و تجزیہ ۲۰۱۲
- تفہیم شعر ۲۰۱۴

ترجمہ

- آدھا گاؤں ۲۰۰۳
- اکی
- فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولس

ترتیب و تالیف

- آزادی کے بعد اردو افسانہ، جلد اول ۲۰۰۳
- آزادی کے بعد اردو افسانہ، جلد دوم ۲۰۰۳
- کائناتِ اردو (جلد اول تا ہفتم) ۲۰۰۴
- احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے ۲۰۰۷
- تحریکِ آزادی ۲۰۰۸

☆☆☆

ترجمہ

- آدھا گاؤں ۲۰۰۳
- اکی
- فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولس

ترتیب و تالیف

- آزادی کے بعد اردو افسانہ، جلد اول ۲۰۰۳
- آزادی کے بعد اردو افسانہ، جلد دوم ۲۰۰۳
- کائناتِ اردو (جلد اول تا ہفتم) ۲۰۰۴
- احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے ۲۰۰۷
- تحریکِ آزادی ۲۰۰۸

☆☆☆

ASLAM JAMSHED PURI KE DEHI AFSANE

by

Furqan Sambhali





EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com
978-93-5073-451-3
₹ 200.00